مثنوی سوز و گداز

شوق نیموی



مرتب

پروفیسر سید مظفر اقبال

بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴

ادب و شعر
6034

مثنوی سوز و گداز

شوق نیموی

گورنمنٹ
اردو لائبریری
پٹنہ-۴
۱۹۲۸ء
۲۳۳۴۲-۳

مثنوی سوز و گداز

GOVT. URDU LIBRARY
ACC.No. 39010
Date 28/12/22
PATNA
ادب و شعر
6034

مصنف

مولانا ظہیر احسن شوق نیموی

مرتب

پروفیسر سید مظفر اقبال

ناشر: بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ ۴

©جملہ حقوق سید محمد اقبال محفوظ

کتاب	:	مثنوی سوز و گداز
مصنف	:	شوق نیموی
مرتب	:	پروفیسر سید مظفر اقبال
اشاعت	:	۲۰۱۸
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۸۰ روپے
کمپوزنگ	:	شادمان کمپیوٹر، رمنہ روڈ، پٹنہ
طباعت	:	دانش کدہ، دریاپور، پٹنہ
ناشر	:	بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

Masnawi Sozo Gudaaz (Shauque Neemvi) Compiled by S.M. Iqbal
Published by Book Emporium, Urdu Bazar, Sabzibagh, Patna-800004
ISBN : 978-81-907039-4-9, Edition-2018, Price Rs. 80.00

فہرست

عرضِ ناشر

مولانا ظہیر احسن شوق نیموی کی مشہور و معروف تصنیف 'مثنوی سوز و گداز' کو پروفیسر سید مظفر اقبال نے ترتیب دیا تھا۔ پہلی اشاعت (۱۹۶۳) کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ لیکن ادھر کئی برسوں سے یہ کتاب کمیاب ہے۔ چونکہ یہ کتاب داخل نصاب ہے اس وجہ سے اس کی ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے۔ طلبہ اور اساتذہ کے اصرار پیہم کے پیشِ نظر یہ کتاب شائع کی جارہی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اسے شائع کرنے کی اجازت جناب سید محمد اقبال بن پروفیسر سید مظفر اقبال صاحب نے تحریری طور پر بھی دی ہے۔ ہم اس کے لیے ان کے ممنون ہیں۔

پروفیسر سید مظفر اقبال صاحب صدر شعبۂ اردو، تلکا مانجھی یونیورسٹی، بھاگلپور سے سبکدوش ہوئے تھے۔ ان کا انتقال ۲۶ رجون ۲۰۱۲ کو ہوا۔ ادارہ بک امپوریم، پٹنہ طلبہ کی ضرورت کے تحت مزید کئی کمیاب درسی کتابیں شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ کتابوں کی عدم دستیابی سے طلبہ کو جو دشواری ہوتی ہے، وہ نہ ہو۔ اگر آپ حضرات کی مخلصانہ توجہ ملی تو ہم اپنے ان عزائم کو تکمیل کی بلندیوں تک لے جائیں گے۔ انشاءاللہ۔

زیر نظر ایڈیشن میں کوئی کمی یا خامی نظر آئے تو از راہ کرم ہمیں مطلع کرنے کی زحمت کریں تاکہ اگلے ایڈیشن میں اس کی تصحیح ہو جائے۔

امتیاز انور فہمی

عرضِ مرتب

اس دورِ بے ادبی میں ادب کے طالب علموں کی توجہ ادبی شاہکاروں کی طرف سے تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ اولاً تو اُن کا مطالعہ اپنے نصاب کی کتابوں تک محدود ہوتا ہے اور اگر کبھی اُن کی نظر اس محدود دائرے سے باہر بھی نکلتی ہے تو بجائے خوب سے خوب تر کی تلاش کے ''زشت'' پر جا کر ٹھہر جاتی ہے یعنی وہ سستی جاسوسی اور رومانی کتابوں میں خود کو گم کر دیتے ہیں۔ اس میں اگر ایک طرف طالب علموں کے کچے اور نابالغ اذہان کا قصور ہے تو دوسری طرف دانش گاہوں کے وہ اربابِ حل وعقد بھی کم قصوروار نہیں جو نصاب میں کسی قسم کی ترمیم یا اضافے کے قائل نہیں۔

عرصۂ دراز سے ملک کی دانش گاہوں کے نصاب میں میر حسنؔ دہلوی اور پنڈت دیا شنکر نسیمؔ لکھنوی کی مثنویاں داخل ہیں اور لوگوں کو یہ مثنویاں اس قدر پسند آ گئی ہیں کہ دوسری مثنویوں کی طرف اُن کی نگاہِ التفات جاتی ہی نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ہمارے ناقدینِ ادب بھی ان ہی دو مثنویوں کو اپنا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ عام قارئین یہ سمجھتے ہیں کہ یا تو ان دو مثنویوں کے علاوہ اُردو میں کوئی تیسری مثنوی موجود ہی نہیں یا اگر موجود ہے تو قابلِ اعتنا نہیں۔ اس حقیقت سے کوئی بدذوق ہی انکار کرسکتا ہے کہ سحرالبیان اور گلزارِ نسیم قدرِ اوّل کی مثنویاں ہیں اور اردو ادب کی تاریخ میں ان کی بلند و بالا ادبی حیثیت مسلم ہے۔ لیکن ایسی بات نہیں کہ ان کے علاوہ اردو میں اچھی مثنویاں نایاب ہیں۔ دکنی مثنویوں کے علاوہ میرؔ، اثرؔ، شوقؔ لکھنوی، شوقؔ قدوائی اور شوقؔ نیموی وغیرہ کی مثنویاں بھی بلاشبہ اس قابل ہیں کہ اُن کا مطالعہ شوق اور لگن کے ساتھ کیا جائے۔

ان ہی خیالات کے پیشِ نظر آج سے تقریباً پچیس چھبیس سال پیش تر میں نے شوقؔ نیموی کی مثنوی سوز وگداز کو مرتب کر کے شایع کیا تھا جو عرصہ دراز تک ملک کی دانش گاہوں کے

نصاب میں شامل رہی ہے اور ادب کے عام قارئین کے درمیان بھی مقبول ہوئی لیکن اب وہ نایاب ہو چکی ہے۔ اس لیے میں اسے ازسرِ نو مرتب کر کے شایع کر رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ میری یہ کوشش بھی بہ نظرِ تحسین دیکھی جائے گی۔

یکم جنوری ۱۹۸۹ء

مظفر اقبال

مثنوی نگاری کا فن

مثنوی وہ صنفِ سخن ہے جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں لیکن اس کے تمام اشعار کے قوافی مختلف ہوتے ہیں یعنی ہر شعر کے بعد قافیہ بدل جاتا ہے۔ دو دو ہم قافیہ مصرعوں کی رعایت سے ہی اس کا نام مثنوی رکھا گیا ہے۔ کیوں کہ لغوی اعتبار سے مثنوی کے معنی ہیں دو دو کیا گیا۔

ماہرینِ عروض نے مثنوی کے لئے اشعار کی تحدید اور اَوزان کی تخصیص بھی کی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ کسی بھی مثنوی میں کم سے کم دو شعر ہونے چاہئیں البتہ زیادہ کی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ اَوزان کے متعلق اُن کا خیال یہ ہے کہ مثنوی چونکہ فارسی کے شعراء کی اختراع ہے اس لئے اس معاملے میں اُن ہی کی پیروی کرنا مناسب ہے۔ فارسی میں مثنوی ذیل کے سات اَوزان میں سے کسی ایک وزن میں لکھی جاتی تھی:۔

۱۔ بحرِ سریع مسدّس مطوی موقوف۔	مفتعلن مفتعلن فاعلات یا فاعلن
۲۔ بحرِ ہزج مسدس مقصور یا محذوف۔	مفاعلن مفاعیلن مفاعیل یا فعولن
۳۔ بحرِ ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور یا محذوف	مفعول مفاعلن فعولن یا مفاعیل
۴۔ بحرِ خفیف مسدس مجنون مقطوع۔	فاعلاتن مفاعلن فعلن
۵۔ بحرِ متقارب مثمن مقصور یا محذوف۔	فعولن فعولن فعولن فعل یا فعول
۶۔ بحرِ رمل مسدّس مقصور یا محذوف۔	فاعلاتن فاعلاتن فاعلات یا فاعلن
۷۔ بحرِ رمل مسدس مجنون مقطوع۔	فاعلاتن فعلاتن فعلن یا فعلات

لیکن اردو میں ان اَوزان کے علاوہ جن دیگر اَوزان میں مثنویاں لکھی گئی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

۸۔ فعلن فعلن فعلن فع یا فعل فعولن فعل فعولن

۹۔ فعلن فعولن فعلن فعولن

۱۰۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

۱۱۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

۱۲۔ مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

۱۳۔ فعولن فعولن فعولن فعولن

۱۴۔ فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

ان بحروں میں میرؔ، رنگینؔ، مومنؔ، حالیؔ، آزادؔ، شوقؔ قدوائی، مرزا رسوا، اقبالؔ، حفیظ اور جگن ناتھ آزادؔ جیسے معروف و مشہور اردو شعراء نے مثنویاں کہی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد مختصر ہے اور زیادہ تر مثنویاں مندرجہ بالا سات اوزان کی مقبولیت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے مولوی جلال الدین احمد جعفری لکھتے ہیں:۔

''یہ کوئی ضروری اور لازمی امر نہیں ہے کہ ان مستعملہ و مروجہ اوزان کے علاوہ کسی دوسرے وزن میں مثنوی لکھنا ناجائز سمجھا جائے البتہ جن وزنوں کو مخصوص کیا گیا ہے ان میں بہ نسبت دوسرے اوزان کے دل کشی اور ترنم اور موزونیت زیادہ ہے۔''[۱]

جعفری صاحب کا یہ بیان کسی حد تک صحیح ضرور ہے لیکن یہ دلکش اوصاف مقررہ سات اوزان کے علاوہ ان اوزان میں بھی موجود ہیں جن کا اضافہ اردو کے مثنوی نگار شعراء نے کیا ہے۔ اس اعتبار سے ان اوزان کے امتیازی اوصاف وہ نہیں ہیں جو جعفری صاحب نے بیان کئے ہیں بلکہ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے اصل اوصاف ان کی روانی اور سہولت میں پوشیدہ ہیں۔ مثنوی چونکہ بیانیہ شاعری کی ایک صنف ہے اور اس میں کوئی واقعہ یا قصہ تسلسل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اس لئے اس کے اوزان کا سہل، سلیس اور رواں ہونا ضروری ہے۔

مثنوی کے ان ہی اوصاف پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:۔

۱۔ تاریخ مثنویات اردو۔ مولفہ جلال الدین احمد جعفری۔ ص ۲۱

''ہیئت کے اعتبار سے مثنوی بیانیہ شاعری کے لئے بدرجۂ اتم موزوں ہے۔ داستان گوئی یا واقعہ نگاری کا لطف اسی میں ہے کہ اس کے ایک بڑے جزو یا ایک واقعہ کو بغیر کسی رکاوٹ کے مسلسل بیان کیا جا سکے۔ اس میں انتشار کا احساس نہ ہو۔ مثنوی میں نثر کا سا تسلسل پایا جاتا ہے۔ دوسری اصناف میں بند کی تقسیم اور قوافی کے متنوع نظام کی وجہ سے سلسلۂ سخن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ قصہ کا تقاضا ہوتا ہے کہ آگے بڑھتا چلا جائے۔ لیکن مسدس یا ترکیب بند میں بار بار ہر بند پر ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ مثنوی میں نثری داستان کا سا غیر منقطع سلسلہ موجود ہوتا ہے۔'' [1]

ڈاکٹر گیان چند کا تجزیہ صحیح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مثنوی بیانیہ اور توضیحی شاعری کے لئے مخصوص ہے اور طویل سے طویل واقعات کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

یہ امر مسلم ہے کہ مثنوی ایک بیانیہ صنف سخن ہے لیکن اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہ محض خارجی واقعات کی مرقع کشی تک محدود ہے۔ یہ واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان کر دینے پر ہی قانع نہیں بلکہ جذبات واحساسات کی ترجمانی بھی بہت ہی کامیابی کے ساتھ کرتی ہے۔ ایک اچھی اور کامیاب مثنوی میں دونوں ہی اوصاف ہوتے ہیں۔ وہ اگر ایک طرف واقعات کا مربوط اور مسلسل بیان ہوتی ہے تو دوسری طرف جذبات و کیفیات کی مکمل آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔ مثنوی کی فوقیت اسی بات میں ہے۔ چنانچہ احسن مارہروی مثنوی کی ان ہی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''جذبات انسانی، مناظر قدرت، تاریخی واقعات جس خوش اسلوبی اور روانی سے مثنوی میں سما سکتے ہیں اُن کی اتنی گنجائش کسی صنف سخن میں نہیں۔ زندگی کے تمام سوانح، رزمیہ ہوں یا تاریخی، عشقیہ ہوں یا اخلاقی، فلسفیانہ ہوں یا افسانہ، غرض کہ تخئیل کی کھپت مثنوی میں ہوتی ہے۔'' [2]

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں (جلد اوّل) مولفہ ڈاکٹر گیان چند۔ مطبوعہ ۱۹۸۷ء ص ۵۸ و ۵۹۔

[2] مقدمۂ کلیاتِ ولی۔ مرتبہ احسن مارہروی، طبع اوّل صفحہ ۷۷

اردو میں مثنویوں کا جو ذخیرہ ملتا ہے انہیں اگر موضوع کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو ان کی مندرجہ ذیل چار قسمیں قرار پاتی ہیں:۔

۱۔ عشقیہ اور تخیلی ۲۔ صوفیانہ اور اخلاقی

۳۔ سیاسی اور تاریخی ۴۔ علمی اور فلسفیانہ

ایسی مثنویاں جن میں حسن و عشق کی تخیلی اور فرضی داستانیں بیان کی گئی ہوں بہت ہی قدیم روایت رکھتی ہیں۔ جنوبی ہند کے شاعر نظامی نے ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ کے درمیان مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' لکھی جسے اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو کی پہلی طویل مثنوی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ۹۸۸ھ سے ۹۹۳ھ کے درمیان مثنوی ''یوسف زلیخا'' ۱۰۱۸ھ میں قطب مشتری، ۱۰۴۵ھ میں سیف الملوک و بدیع الجمال اور ۱۰۳۵ھ سے ۱۰۴۸ھ کے درمیان چندر بدن و ماہ یار لکھی گئیں۔ اس نوع کی مثنوی نگاری عہد بہ عہد ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ میر حسن نے سحر البیان، میر نے شعلۂ عشق اور دریائے عشق، نواب مرزا شوق لکھنوی نے زہر عشق اور مولانا شوق نیموی نے سوز و گداز لکھ کر اسے ترقی کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچا دیا۔

صوفیانہ اور اخلاقی نوعیت کی مثنویوں کی تاریخ بھی قدیم ہے۔ صوفیائے کرام کی مختصر مثنویوں کے علاوہ طویل مثنویوں میں رستمی کی خاور نامہ اور خواجہ محمود بحری کی من لگن علی الترتیب ۱۰۵۹ھ اور ۱۱۱۲ھ میں لکھی گئی ہیں۔ ان دونوں کا موضوع اخلاق و تصوف ہے۔ سیاسی اور تاریخی نوعیت کی مثنویوں کا سراغ بھی عہد قدیم ہی میں مل جاتا ہے۔ مثلاً بیجاپور کے فرمان روا علی عادل شاہ ثانی کے دربار کے ملک الشعراء نصرتی کی مثنوی علی نامہ کو پیش کیا جا سکتا ہے جو ایک تاریخی رزمیہ ہے۔ اس میں علی عادل شاہ ثانی، مغلوں اور شیواجی کی جنگوں کے نہایت نفیس مرقع پیش کئے گئے ہیں۔ اسی طرح میر کی مثنوی شکار نامہ کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے جس میں نواب آصف الدولہ کے شکار کی تفصیل درج ہے۔ دورِ جدید میں شاد عظیم آبادی، سرور کابری اور حفیظ جالندھری نے اس نوع کی مثنوی نگاری کو مزید فروغ بخشا۔ علمی اور فلسفیانہ انداز کی مثنویاں عہد قدیم میں شاذ و نادر ہی لکھی گئی ہیں۔ ان کی طرف پوری توجہ عہدِ جدید ہی میں دی گئی ہے۔ شاد عظیم آبادی، علامہ اقبال، جمیل مظہری اور عبدالمجید شمس عظیم آبادی وغیرہ نے اس نوع کی مثنوی کو ترقی دی ہے۔

ان موضوعات کے علاوہ زندگی اور معاشرت کے دوسرے پہلوؤں پر بھی مثنویاں ملتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مثنوی کے لئے موضوع کی کوئی تخصیص نہیں۔ ابتداء میں مثنوی واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان کرنے کے لئے وضع کی گئی تھی۔ واقعات کا تعلق تاریخ سے بھی ہے اور افسانے سے بھی۔ چنانچہ تاریخی مثنویاں اکثر رزمیہ ہوتی ہیں اور افسانوی مثنویاں بیش تر عشقیہ لیکن مثنوی نگار شعراء نے کوئی حد بندی قبول نہیں کی اور انہوں نے اپنی مثنویوں میں زندگی کے تمام موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس اعتبار سے مثنوی ایک ہمہ گیر اور جامع صنف سخن ہے۔

مختصر مثنویوں سے قطع نظر قدیم رنگ کی طویل مثنویوں کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ ڈاکٹر گیان چند نے بہت ہی بہتر طور پر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''قدیم رنگ کی مثنویوں میں کئی جزو ہوتے ہیں لیکن اس کی سختی کے ساتھ پابندی نہیں کی جاتی بلکہ شاعر حسبِ مرضی ان میں ترمیم کر لیتا ہے۔ نظم کی ابتداء حمد اور نعت سے ہوتی ہے۔ شیعہ حضرات منقبت حضرت علی اور مدح ائمہ بھی لکھتے ہیں۔ مذہبی بزرگوں کی مدح وتوصیف کے بعد شاعر کے مربی کی مبالغہ آمیز تعریف ہوتی ہے۔ یہ مربی بادشاہ، نواب، وزیر سے لیکر کوئی معمولی رئیس تک ہوسکتا ہے۔ بعض شعراء تعریفِ سخن یا تعریف خامہ یا مناجاتِ عاشقانہ بھی تحریر کر دیتے ہیں لیکن یہ نہایت شاذ ہے۔ مدحتِ طرازی کے بعد سببِ تالیف یا وجہ تصنیف کا جزو ہوتا ہے، اس سے مصنف اور مثنوی کے مآخذ کے متعلق بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہیں۔
>
> اس تمہید کے بعد اصل داستان شروع ہوتی ہے۔ بعض شعراء اس مقام پر ساقی نامہ لکھ دیتے ہیں۔ طویل مثنویوں کو کئی فصلوں یا داستانوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ان داستانوں کے آغاز میں بھی دو تین اشعار کا ساقی نامہ ہوتا ہے۔ نسیم نے ساقی نامہ کی بجائے قلم کا ذکر چھیڑا ہے۔ مثنوی کے اخیر میں چند اشعار کا خاتمہ ہوتا ہے جس میں شاعر اپنی عرق ریزی کی داد چاہتا ہے یا خود ہی اپنی تعریف کر کے جی بہلا لیتا ہے یا بارگاہِ ایزدی میں اس دماغی

ہفت خوان کے انجام ہونے پر تشکر پیش کرتا ہے یا پھر وہی دل خوش کن تمنا کہ جس طرح اشخاصِ مثنوی کے دن پھرے ہیں ہمارے تمہارے بھی دن پھریں۔"[1]

مثنوی کے یہ اجزا باہم دگر مربوط اور منظم ہوتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے ملکر بہترین تاثر پیش کرتے ہیں چنانچہ ایک کامیاب مثنوی کا مطالعہ ہمیں بیک وقت مسرت اور بصیرت دونوں ہی عطا کرتا ہے۔

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں، جلد اوّل۔ مولفہ ڈاکٹر گیان چند۔ مطبوعہ ۱۹۸۷ء

اردو میں مثنوی نگاری کا آغاز وارتقاء

اردو شاعری کی نشو ونما فارسی شاعری کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ چنانچہ ابتداء میں اردو شعراء نے ان تمام صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے جو فارسی شاعری میں معروف ومقبول تھیں۔ مثلاً غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی اور مثنوی وغیرہ۔

اردو میں مثنوی نگاری کا آغاز اردو شاعری کے دورِ تشکیل میں ہی ہو چکا تھا چنانچہ اردو ادب کے بنیاد گذار صوفیائے کرام کے کلام کے ذخیرے میں مختصر مثنویاں ملتی ہیں جن کا ذکر مولوی عبدالحق نے ''اردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام''، حافظ محمود شیرازی نے ''پنجاب میں اردو'' اور نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اردو'' میں کیا ہے۔ ان مختصر مثنویوں سے قطع نظر اردو میں طویل مثنویوں کی روایت بھی خاصی قدیم ہے۔ ابتک کی تحقیق کے مطابق اردو کی اولین طویل مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے جسے نظامؔی نے احمد شاہ ثالث بہمنی کے دورِ اقتدار میں ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ کے درمیان قلم بند کیا تھا۔ اس کے بعد جنوبی ہند میں اردو میں مثنوی نگاری کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ولؔی اور سراؔج تک بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہا۔ اس دور میں فیروؔز بیدری، شاہ میران جی، شمس العشاقؔ اور شاہ برہان الدین جانمؔ کی مختصر مثنویوں کے علاوہ اشرفؔ کی نوسرہار (۹۰۹ھ)، وجہؔی کی ''قطب مشتری'' (۱۰۱۸ھ)، غواصؔی کی ''سیف الملوک وبدیع الجمال'' (۱۰۳۵ھ)، مقیمؔی کی ''چندر بدن وماہ یار'' (۱۰۳۵ھ سے ۱۰۳۸ھ کے درمیان)، رستمؔی کی ''خاور نامہ'' (۱۰۵۹ھ)، جنیدؔی کی ''ماہ پیکر'' (۱۰۶۶ھ)، نصرتؔی کی ''گلشن عشق'' (۱۰۶۸ھ) اور ''علی نامہ''۔ طبعؔی کی ''بہرام و گل اندام'' (۱۰۸۱ھ)، غلام علی کی ''پدماوت'' (۱۰۹۷ھ)، عاجزؔ کی ''ملکۂ مصر'' (۱۱۰۰ھ)، بحرؔی کی ''من لگن'' (۱۱۱۲ھ)، ولؔی کی ''در تعریف سورت'' اور سراؔج کی ''بوستان خیال'' جیسی معروف و مقبول مثنویاں عالم وجود میں آئیں۔

ان مثنویوں میں وجہی کی ''قطب مشتری''، غواصی کی ''سیف الملوک و بدیع الجمال''، مقیمی کی ''چندر بدن و ماہ یار'' اور سراج کی ''بوستانِ خیال'' کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

قطب مشتری: وجہی کی ایک طبع زاد مثنوی ہے جس میں اس نے اپنے ممدوح قلی قطب شاہ اور اس کی منظورِ نظر بھاگ متی کے عشق کی داستان کو افسانوی انداز میں بیان کیا ہے۔ وجہی اپنے عہد کا ایک باشعور فنکار تھا چنانچہ قطب مشتری میں اس نے اپنی فنکاری کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔ واقعات کے بیان میں تسلسل اور روانی بدرجۂ اتم موجود ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس مثنوی میں نہایت نادر تشبیہیں اور اعلیٰ درجہ کی مرقع نگاری کے نمونے بھی ملتے ہیں۔

سیف الملوک و بدیع الجمال: میں اگرچہ کوئی طبع زاد قصہ پیش نہیں کیا گیا ہے لیکن اپنی سلاست، روانی اور دیگر شعری و ادبی خوبیوں کی بدولت اس نے ادب العالیہ کا درجہ اختیار کر لیا ہے۔ اس مثنوی کی بدولت غواصی نے اپنی زندگی میں ہی قابلِ رشک شہرت حاصل کر لی تھی یہاں تک کہ وجہی جیسا عظیم شاعر اور کہنہ مشق ادیب بھی اس کی شہرت پر رشک کرتا تھا۔

چندر بدن و ماہ یار: مقیمی کا ایک شاہکار ہے۔ اس کا قصہ طبع زاد ہے اور اس کے اشخاص اور مقام سب ہندوستانی ہیں۔ اس کا قصہ اس قدر مقبول ہوا کہ بعد کے اکثر شعراء اس کے حوالے دیتے ہیں۔ ابن نشاطی نے اپنی مثنوی ''پھول بن'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ میر، مصحفی اور شوق نیموی نے اپنی مثنویوں خصوصاً دریائے عشق، بحر المحبت اور سوز و گداز میں اس مثنوی کے قصے کا تتبع کیا ہے۔ چندر بدن اور ماہ یار نے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا اور دمن کی طرح شہرت حاصل کی چنانچہ مثالی ہیرو اور ہیروئن کی حیثیت سے ان کا ذکر مثنویوں کے علاوہ غزلوں میں بھی ملتا ہے۔ مقیمی نے اپنی مثنوی کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اس نے یہ مثنوی غواصی کی مثنوی کے تتبع میں لکھی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چندر بدن و ماہ یار کو سیف الملوک و بدیع الجمال سے کہیں زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو اس کا المیہ قصہ ہے جس کا انجام اس سے پیش تر کی دوسری داستانی مثنویوں کے برعکس عاشق و معشوق کی حسرت ناک موت پر ہوتا ہے۔ اس کا خلاصہ ڈاکٹر گیان چند کے الفاظ میں درج ذیل ہے:-

''شہر چندر پٹن کی شہزادی چندر بدن بہت حسین ہے۔ وہاں کے سالانہ

میلے کے موقع پر کسی شہر کا مسلمان تاجر زادہ ماہ یار اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔
مہیار چندر بدن کے پاؤں پر گرتا ہے لیکن وہ ٹھکرا کر چلی جاتی ہے۔ انجم نگر
کا بادشاہ مہیار کی مدد کو آتا ہے لیکن چندر بدن کا باپ اس رشتہ کو منظور نہیں
کرتا کیونکہ مذہب کی دیوار حائلِ راہ ہے۔
آخر مہیار غمِ جدائی میں مر جاتا ہے۔ جب اس کا جنازہ مدفن کو جاتا ہے تو
چندر بدن کے محل کے نیچے جا کر رک جاتا ہے۔ چندر بدن اپنے باپ کی
اجازت سے وہاں آتی ہے، اسلام قبول کرتی ہے اور جنازہ کے پہلو میں
لیٹ کر مر جاتی ہے۔ جنازہ آگے بڑھ جاتا ہے مدفن میں تابوت کھولنے پر
معلوم ہوتا ہے کہ دونوں لاشیں اس طرح چسپاں ہیں کہ کسی طرح جدا نہیں
کی جا سکتیں۔ مجبوراً دونوں ایک ساتھ دفن کر دیئے جاتے ہیں۔"[1]

اس قصّے میں جذبات کی شدت موجود ہے لیکن کوئی مافوق الفطری عنصر نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کی عشقیہ مثنویوں پر اس مثنوی کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اس مثنوی کی ایک دوسری اہم خصوصیت زبان و بیان کی صفائی، سلاست اور روانی ہے۔

عہدِ ولؔی میں سراؔج کی مثنوی بوستانِ خیال ایک بلند پایہ مثنوی ہے۔ اس مثنوی کا امتیاز اس کے قصّے میں نہیں بلکہ مناظر کی خوبصورت عکاسی اور جذبات کی صورت گری میں ہے۔ اس کے علاوہ بیان کی روانی اور زبان کی سلاست و فصاحت بھی اس مثنوی کے امتیازی اوصاف جو خواجہ میر اثؔر دہلوی کی مثنوی "خواب و خیال" اور میر حسؔن کی مثنوی "سحر البیان" سے کسی طرح کم نہیں۔

جنوب کی طرح شمال میں بھی مثنوی نگاری کی روایت کا سراغ عہدِ قدیم میں ہی مل جاتا ہے۔ حضرت بابا شیخ فرید شکر گنج (متوفی ۶۶۴ھ)، حضرت امیر خسؔرو دہلوی (متوفی ۷۲۰ھ) اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی ۹۴۵ھ) کی مختصر مثنویوں سے قطع نظر شمال کی پہلی طویل مثنوی افضؔل کی "بکٹ کہانی" ہے جو ۱۰۳۵ھ سے پیش تر کی تصنیف ہے اس لئے کہ مولینا محمد افضل

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں، جلد اوّل، مطبوعہ ۱۹۸۷ء ص ۱۱۹ و ۱۲۰

جھنجھانوی یا پانی پتی کا سالِ وفات ۱۰۳۵ھ ہے۔[1] اس میں اگرچہ کوئی بسیط کہانی نہیں لیکن قصہ گوئی اور واقعہ نگاری کی ایک ابتدائی شکل موجود ہے اور پوری مثنوی بارہ ماسہ کے طرز پر لکھی گئی ہے۔اس کے متعلق ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:۔

''افضل کی نظم کا اصل نام'' بکٹ کہانی'' ہی ہے جو مثنوی کے انداز میں بحرِ ہزج مسدس محذوف الآخر (مفاعیلن مفاعیلن فعولن) میں لکھی گئی ہے۔ بعض اشعار بحر ہزج مسدس مقصور الآخر میں بھی ہیں۔گراہم بیلی کا یہ خیال غلط ہے کہ اس کی بحر ہندی شاعری کی ہے تاہم یہ ہندی روایت شعری میں ڈوبی ہوئی ہے اور مثنوی کی بحر اور طرز میں ہونے کے باوجود ہیئت کے اعتبار سے جدید آریائی زبانوں کے ابتدائی اور درمیانی دور کی مقبولِ عام صنفِ سخن بارہ ماسہ میں ہے۔[2]

افضل کے بعد عہد ولی میں شمالی ہند کے شعراء کے درمیان فائز دہلوی، شاہ مبارک آبرو، جعفر علی خاں زکی اور ظہور الدین حاتم نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔کلیات فائز میں تقریباً پندرہ مختصر مثنویاں ہیں جن میں تعریف پنگھٹ، تعریف ہولی، تعریف نہان نگم بود، تعریف جوگن، وصفِ کاچن، تعریف تنبولن، وصف بھنگیرن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اسی طرح آبرو کی مثنوی: موعظت آرائش معشوق اور حاتم کی چند مختصر مثنویاں مثلاً: سراپا، ساقی نامہ، وصفِ قہوہ اور وصفِ تماکو وحقہ بھی قابلِ ذکر ہیں۔لیکن افضل کی'' بکٹ کہانی'' کے بعد شمالی ہند میں جو دوسری اہم طویل مثنوی ملتی ہے وہ بہار کے صوفی بزرگ حضرت آیت اللہ جوہری کی'' گوہر جوہری'' ہے۔یہ ۱۱۶۱ھ میں لکھی گئی۔اس پر افضل کی مثنوی'' بکٹ کہانی'' کا اثر بہت ہی واضح طور پر نظر آتا ہے۔تقریباً اسی عہد میں میر، سودا، مصحفی، جرأت، رنگین، راغب اور راسخ عظیم آبادی نے اپنی تخلیقات سے اس صنف سخن کو فروغ بخشا۔میر کی مثنویوں میں شعلۂ عشق، دریائے عشق اور جوش عشق۔مصحفی کی بحرالمحبت، راغب کی سورش عشق اور فتح نامہ اور راسخ عظیم آبادی کی ناز و نیاز، سبیل نجات، کشش عشق، جذبۂ

---

[1] پنجاب میں اردو، مولفہ حافظ محمود شیرازی، ص ۱۸۲

[2] شعر و زبان مصنفہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ص ۱۶

عشق اور نیرنگ محبت قابل ذکر ہیں لیکن اس عہد کی مثنویوں میں خواجہ میر آثر دہلوی کی مثنوی خواب و خیال (۱۱۹۵ھ سے ۱۱۹۹ھ کے درمیان لکھی گئی) اور میر حسن کی سحر البیان (۱۱۹۹ھ) نے جو مقبولیت اور شہرت حاصل کی وہ کسی دوسری مثنوی کو حاصل نہ ہو سکی۔

میر حسن کی سحر البیان کے بعد جس مثنوی نے غیر معمولی شہرت حاصل کی وہ گلزارِ نسیم ہے جو تقریباً ۱۲۵۴ھ میں عالمِ وجود میں آئی۔ نسیم کے بعد اس صنفِ سخن کو مزید فروغ دینے والوں میں قلق، واجد علی، شاہ اختر، نواب مرزا شوق لکھنوی، شوق قدوائی داغ دہلوی اور مولینا شوق نیموی کے نام نمایاں ہیں۔ ان شعرائے کرام کی مثنویوں میں طلسمِ الفت، افسانۂ عشق، دریائے تعشق، بحر الفت، زہر عشق، عالمِ خیال، فریادِ داغ، اور سوز و گداز نے خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔

اس عہد کے بعد مولینا محمد حسین آزاد اور حالی کی کوششوں سے یہ صنف سخن جدید انداز کی موضوعاتی نظموں کے لئے زیادہ کارآمد ثابت ہوئی۔ چنانچہ آزاد، حالی، شبلی، اکبر، شاد عظیم آبادی اور علامہ اقبال نے جدید انداز کی نظمیں اس صنف میں کثرت سے تخلیق کیں لیکن طویل مثنویوں کا سلسلہ بھی جاری رہا چنانچہ حفیظ جالندھری نے شاہنامۂ اسلام، علامہ سریر کابری نے شاہنامۂ ہند، شایاں نے مہابھارت، جگت موہن لال رواں نے نقدِ رواں، جگر بریلوی نے پیام ساوتری، جمیل مظہری نے آب و سراب اور نان و نمک، علی سردار جعفری نے جمہور، کیفی اعظمی نے خانہ جنگی اور پروفیسر عبدالمجید شمس عظیم آبادی نے حیات و کائنات اور جلوۂ صد رنگ لکھ کر اس روایت کو زندہ رکھا ہے۔

مثنوی سوز و گداز کے مصنّف کے حالاتِ زندگی

تاریخی نام ظہیر الاسلام تھا جس سے سنِ ولادت ۱۲۷۸ھ نکلتا ہے۔ پورا نام محمد ظہیر احسن اور تخلص شوقؔ ہے، موضع نیمی ضلع عظیم آباد میں پیدا ہوئے، آپ کے والد کا نام شیخ سبحان علی ہے جو شیخ عبدالہادی زاہدی صدیقی کی اولاد میں تھے۔ ابتدائی تعلیم شمس العلماء محمد سعید حسرتؔ عظیم آبادی سے حاصل کی ۱۲۹۶ھ میں غازی پور جا کر مدرسۂ چشمۂ رحمت میں مولانا حافظ محمد عبداللہ سے تکمیل کی اور شاعری میں مولانا عبدالاحد شمشادؔ فرنگی محلی لکھنوی کے شاگرد ہوئے جو اُس وقت مدرسۂ ہذا میں مدرس اوّل تھے۔ اس کے بعد لکھنؤ جا کر مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی سے علوم عربیہ کی تکمیل کی اور حکیم سید باقر حسین صاحب سے طب پڑھی اور فارغ التحصیل ہوئے۔ اسی اثناء میں مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے مرید بھی ہوئے۔ لکھنؤ ہی کے قیام کے زمانے میں منشی امیر اللہ تسلیم سے بھی تلمذ حاصل کیا۔ علم منقول اور علم معقول میں کامل دستگاہ حاصل کی اور ساتھ ساتھ شاعری میں بھی مہارت تام بہم پہونچائی۔

جناب شوقؔ کا شمار صوبۂ بہار کے مشاہیر علم دوست حضرات میں ہوتا ہے۔ ان کے ذاتی کتب خانہ میں نادر قلمی کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا، چنانچہ جوشش عظیم آبادی کے دیوان کا واحد قلمی نسخہ اسی کتب خانہ میں ملا تھا۔ اسی طرح لالہ رام چند فرحتؔ عظیم آبادی کی نادر مثنوی کے دو دفتر جو اب خدا بخش لائبریری میں ہیں، یہیں دستیاب ہوئے تھے۔

تصانیف و تالیف:

جناب شوقؔ نے کثرت سے کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی اہم تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) آثار السنن:۔ مذہب حنفیہ کی تائید میں احادیث کا مجموعہ

(۲) اوشحط الجید:۔ ائمہ اربعہ کی سوانح عمری کے متعلق

(۳) حبل المتین:۔ آمین بالخفاء کی بحث میں

(۴) جلاء العین:۔رفع یدین کی بحث میں

(۵) ردالسکین:۔حبل المتین کی تائید میں

(۶) بجلی:۔مولوی محمد علی صاحب ساکن مئو کے رسالے کا جواب

(۷) جامع الآثار:۔صلوٰۃ الجمعہ فی القریٰ کے عدم جواز کی بحث میں

(۸) لامع الانوار:مذہب المختار کے جواب میں

(۹) مقالہ کاملہ:۔مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے ملفوظات۔

یہ کتابیں عقائد سے تعلق رکھتی ہیں،ان میں سے اوّل الذکر ہندوستان کے متعدد مدارس کے نصاب میں ہنوز داخل ہے اوران میں سے اکثر کتابیں علماء کے حلقے میں بہت مقبول ہیں۔لیکن جن کتابوں نے شعراء اورادیبوں کے حلقے میں دھوم مچادی اورجن کے باعث جناب شوقؔ سارے ہندوستان میں مسلم الثبوت محقق اوراستادفن تسلیم کرلئے گئے وہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) ازاحۃ الاغلاط:۔الفاظ کی صحت اورعدم صحت کی تحقیق جس میں اساتذہ کے اشعار بطور سند درج ہیں۔

(۲) اصلاح:۔اردوانشاپردازی اورشعرگوئی کے باب میں۔

(۳) ایضاح:۔رسالۂ اصلاح کی تائید میں

(۴) سُرمۂ تحقیق:۔سابق الذکررسائل کی تائید میں۔

(۵) یادگاروطن:۔اپنے وطن اوراہل وطن کے تذکرے اورعلمی مباحث

(۶) سیربنگالہ:۔بنگال کے حالات اوردلچسپ اشعار۔

(۷) مثنویٔ سوزوگداز:۔حسن اورشام سندر کے بے مثال عشق پرایک دلچسپ مثنوی

(۸) نظم سحرساز:۔قصائد،قطعات،رباعیات،اورتقریباًسو(۱۰۰)غزلوں پرمشتمل ہے۔

۱۸۹۲ء میں علم عروض وبلاغت کی مشہورکتاب ''حدائق البلاغت''مصنفہ میرشمس الدین فقیر،مولاناعبدالاحد شمشاد لکھنوی کے حواشی کے ساتھ حضرت شوقؔ نیموی کی نگرانی میں طبع ہوئی چنانچہ بعض مقامات پرشوقؔ نیموی کے حواشی ان کے نام کے ساتھ مندرج ہیں۔

جناب شوقؔ نیموی نے ۱۳۲۲ھ میں وفات پائی۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مثنوی سوز وگداز کا خلاصہ

سوز وگداز عشق کی یہ حیرت انگیز داستان یوں شروع ہوتی ہے کہ ۔

عظیم آباد میں اک نوجواں تھا　　ریاضِ حسن کا سروِ رواں تھا
نہال بوستانِ عیش و آرام　　گلِ گلزار استغنا حسن نام

حسن تمام دُنیاوی تفکرات سے آزاد اور درد وغم سے نا آشنا تھا۔ ایک روز وہ دریائے گنگا کے کنارے سیر کے لئے گیا، اتفاق سے اسی وقت ایک نہایت ہی حسین وجمیل دوشیزہ اپنی ہمجولیوں کے ساتھ گنگا اشنان کے لئے آئی تھی، حسن کی نظر اس پری وش پر پڑی تو اُس کے ہوش اُڑ گئے، دل ہاتھوں سے جاتا رہا اور یہ حال ہوا کہ ۔

تحیّر سے بنا تصویر بے جاں　　سراپا صورتِ آئینہ حیراں

حسن کی یہ وارفتگی اُس دوشیزہ سے بھی چھپی نہ رہی ۔

یکا یک اُس پری کی لڑگئی آنکھ　　جوانِ خستہ دل پر پڑگئی آنکھ

حسن کی اس جنونی کیفیت کو دیکھ کر پہلے تو وہ متحیّر ہوئی لیکن جب اُسے اس امر کا احساس ہوا کہ یہ اسی کے حسن کرشمہ ساز کا نتیجہ ہے تو شرما کر اس نے حسن کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں لیکن اتنی ہی دیر میں تیرِ عشق اپنا کام کر گیا۔

اس کے بعد اس دوشیزہ نے اپنی سکھیوں کے ساتھ گنگا میں غسل کیا اور نئے کپڑے زیب تن کئے جس سے اس کے حُسن میں چار چاند لگ گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر حسن کا دل قابو سے باہر ہو گیا اور اس نے دردانگیز آہ کھینچی جس کا اثر اس دوشیزہ پر بھی ہوا۔ لیکن اس کی سکھیاں اس راز و نیاز سے قطعی بے خبر تھیں، چنانچہ جب اُنہوں نے ۔

کہا اس ماہ سے اے شام سُندر　　بہت دن چڑھ گیا جلد اب چلو گھر

تو وہ ناچار اُن کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوئی لیکن اس کے قدم مشکل سے اُٹھ رہے تھے۔ محبت دامنِ دل کھینچتی تھی لیکن وہ مجبور تھی، حسن نے جب اسے جاتے دیکھا تو اس کی بے تابی اور بڑھ گئی یہاں تک کہ محبت کی کشش سے مجبور ہو کر اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ شام سندر گو ضبط سے کام لے رہی تھی لیکن اضطراب دل سے مجبور ہو کر ۔

نگاہِ یاس سے پھر پھر کے دیکھا　　بہانے سے اسے ہر پھر کے دیکھا

یہاں تک کہ شام سندر کا گھر آ گیا اور گھر کے اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے حسن کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا، جب دونوں کی نگاہیں ملیں تو سینے سے آہیں بلند ہوئیں لیکن لوگوں کے ڈر سے شام سندر جھٹ پٹ گھر کے اندر چلی گئی۔ ادھر حسن دیوانوں کی طرح گریبان پھاڑتا اور خاک اُڑاتا ہوا بڑی مشکل سے اپنے گھر تک پہونچا لیکن گھر پہونچ کر بھی مصروفِ فریاد و فغاں ہی رہا اور نوبت بہ اینجا رسید کہ ۔

رواں ہر لحظہ اشکِ دیدۂ تر　　زباں پر شام سندر شام سندر

حسن کے عزیز و اقارب نے اس کی یہ حالت دیکھی تو انہیں گمان ہوا کہ اسے جنون ہو گیا ہے چنانچہ فصاد کو بلا کر اس کے خون کی اصلاح کی تدبیریں کی جانے لگیں لیکن اس کی حالت جوں کی توں رہی، آخر کار مجبور ہو کر لوگوں نے اسے گھر میں بند کر دیا۔ وہاں بھی وہ اپنے محبوب کی یاد میں آہ و نالہ بلند کرتا رہا یہاں تک کہ اسے نیند آ گئی، خواب میں اس نے شام سُندر کو دیکھا کہ وہ اس کے پاس آئی ہے اور کہتی ہے ۔

فدا جب سے کہ تو مجھ پر ہوا ہے　　مرا دل آپ سے باہر ہوا ہے

اور پھر سمجھاتی ہے کہ ۔

رہے اتنا خیال شام سندر　　کہ حرف آنے نہ پائے آبرو پر
کبھی لب پر نہ آئے نام میرا　　کہ ہوگا راز طشت از بام میرا

لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتی ہے کہ ۔

خدا حافظ ترا جاتی ہوں اب گھر　　مرے غم میں نہ کرنا حال ابتر
مگر دل سے نہ مجھ کو بھول جانا　　کسی گُل پر نہ ہرگز پھول جانا

حسن کی جب آنکھ کھلی تو جوشِ وحشت کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا یہاں تک کہ ؎

لہو سر سے بہایا فصد کھولی جنوں نے خوب کھیلی اس سے ہولی

عزیز و اقارب نے جب اس کا یہ حال دیکھا تو اسے آزاد کر دیا، آزاد ہوتے ہی وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا اور اِدھر اُدھر کی خاک چھانتا ہوا آخر کار کوچۂ دلدار میں پہونچ گیا لوگوں کو ایک مشغلہ ہاتھ آیا اور اس سے نام و نشان پوچھنے لگے۔ حسن نے بھی اپنا راز کھولنا چاہا لیکن ؎

جو چاہا کھولے رازِ حیرت آگیں ہوا مہر دہن وہ خواب دوشیں

اس آوارہ حال کو دیکھنے کے لئے دوسرے گھروں کی عورتوں کی طرح شام سندر کے گھر کی عورتیں بھی اِدھر اُدھر سے جھانکنے لگیں اور شام سندر کو جب یہ خبر ملی تو اسے ؎

خیال عاشق ناشاد آیا وہ ناکام تمنا یاد آیا

بڑھی، جھجکی ہٹی پیچھے کئی بار چلی پھر جذب دل سے ہو کے ناچار

یہاں تک کہ چھت پر آئی اور جب حسن کو اس حال میں دیکھا تو بے چین ہو گئی۔ حسن بھی اسے دیکھ کر بے تاب ہو گیا اور اس کے دل سے ایک درد خیز آہ نکلی جسے سُن کر شام سُندر غش کھا کر چھت سے گر پڑی، حسن نے دوڑ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور پھر خود بھی ہوش و حواس کھو بیٹھا اور اس طرح کچھ دیر تک یہ عاشق و معشوق بیہوش لیکن ہم آغوش پڑے رہے یہاں تک کہ ہجوم میں سے کسی نے ان کے مُنھ پر پانی کے چھینٹے ڈالے تو انہیں ہوش آیا۔ ہوش میں آتے ہی شام سُندر مارے شرم و حیا کے پسینے پسینے ہو گئی، آخر کار اس کے گھر والے اسے گھر کے اندر لے گئے اور ہجوم میں یہ قیاس آرائیاں ہونے لگیں کہ شاید یہ چشم بد کا اثر تھا یا اس نازنین سے اس آوارہ حال شخص کا غم نہ دیکھا گیا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ غرض یہ کہ اصل حالت سے کسی کو واقفیت نہیں ہوئی۔ ادھر حسن نے دیکھا کہ زیادہ دیر تک ٹھہرنے میں افشائے راز کا اندیشہ ہے اس لئے ؎

ہوا آندھی وہاں دم بھر نہ ٹھہرا بگولے کی طرح لی راہ صحرا

کچھ عرصہ تک تو وہ صحرا نوردی کرتا رہا لیکن پھر جوشِ اُلفت سے مجبور ہو کر شوق دیدار میں کوچۂ یار کی طرف سادھو کے بھیس میں روانہ ہوا اور دوپہر کے وقت شام سُندر کے دروازہ پر پہونچ کر فقیرانہ صدائیں لگائیں، اس وقت گھر کے کل لوگ محوِ خواب تھے لیکن شام سُندر جاگ رہی تھی۔ چنانچہ فقیر

کی صدا سُن کر وہ چھت پر آئی اور غور سے دیکھا تو:

پایا عاشقِ شوریدہ جاں کو

اس نے اپنے گلے کا بیش قیمت ہار اُتار کر اُس کی طرف پھینک دیا، حسن نے بھی شام سندر کو دیکھا اور پھر دونوں ایک دوسرے سے کچھ دیر تک اشاروں میں گفتگو کرتے رہے اس کے بعد موقع پا کر آشنائے تکلم ہوئے (یاد رہے کہ دونوں کی یہ پہلی گفتگو ہے) شام سندر نے حسن سے پوچھا۔

کہاں ہے گھر تمہارا نام کیا ہے   یہاں آنا ہوا کیوں کام کیا ہے

حسن نے جواب دیا۔

کہا چھوٹی پٹن دیہی مکاں ہے   حسن ہے نام کام آہ و فغاں ہے
تری اُلفت میں سودائی بنا میں   غبار کوئے رسوائی بنا میں

اور پھر ساری داستان سناڈالی، شام سُندر نے بھی اقرار عشق کیا اور کہا۔

نجانے پڑھ دیا کیا تو نے انچھر   مرا دل ہو گیا قابو سے باہر
میں واری تیری آہِ آتشیں پر   گرایا مجھ کو کوٹھے سے زمیں پر

ابھی دونوں میں یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ گھر کے کچھ لوگ بیدا ہو گئے اور شام سندر جھٹ سے چھت سے نیچے اُتر گئی، حسن بھی وہاں سے کھسک گیا اور پھر جنگل کی راہ لی، لیکن کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ پھر شوقِ دیدار بھڑک اُٹھا اور اس بار وہ ایک برہمن کے بھیس میں چوک کی طرف آیا جہاں شام سُندر کے باپ کی دوکان تھی، بازار کے لوگ اس کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئے، شام سُندر کے باپ نے بھی یہ سمجھا کہ یہ برہمن ایک بے مثل پنڈت ہے چنانچہ عقیدت کے ساتھ اس کا نام پتہ دریافت کرنے لگا۔

کہا کیا نام ہے بولا پرسرآم   جو گھر پوچھا تو کاشی جی لیا نام
وہ بولا جوڑ کر ہاتھ اے مہاراج   ہمارے گھر میں کرپا کیجئے آج

حسن کے دل کی مراد بر آئی لیکن پہلے انکار کیا اور جب شام سندر کے باپ نے اصرار کیا تو راضی ہو گیا اور اس کے ساتھ اُس کے گھر پہونچا، وہاں مہاجن نے اس سے کتھا سُنانے کی استدعا کی۔ حسن اس کے لئے پہلے ہی سے تیار ہو کر آیا تھا چنانچہ محفل جمی اور حسن نے کتھا شروع کی لیکن اس سے پہلے

شام سندر بن ٹھن کر ہاتھ میں ایک مالا لئے ہوئے آئی، وہ اس وقت تک قطعی بے خبر تھی کہ پرسرام کے بھیس میں حسن ہے لیکن ۔

اٹھا کر سر جو پہنایا اُسے ہار ہوئی حیرت جب آنکھیں ہوگئیں چار

لیکن خاموش رہی، حسن اردو وفارسی کے ساتھ بھاشا کا بھی ماہر تھا اور ساتھ ہی بالمیکی اور تلسی جی کی رامائن پنڈتوں سے پڑھ چکا تھا، چنانچہ اس کی تقریر سے سب لوگ متاثر ہوئے لیکن جہاں رام کی بات آتی وہاں وہ اپنا حال بیان کرتا اور جہاں حسن سیتا کا ذکر آتا وہاں شام سندر کا سراپا بیان کرتا، دوسرے لوگ تو تہ تک نہیں پہونچ پاتے لیکن ۔

پتے کی بات پا کر شام سندر ادا سے مسکرا دیتی تھی اکثر

یہاں تک کہ رامائن کی کتھا ختم ہوئی اور افشائے راز کے خوف سے حسن نے سامان سفر باندھا، ہر چند لوگوں نے روکنا چاہا لیکن نہیں رُکا۔ روانگی کے وقت شام سُندر بہانہ ڈھونڈھ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی اور اس طرح وہ دیدار یار کی دولت سے بہرہ ور ہو کر وہاں سے روانہ ہوا۔ کتھا سے فارغ ہو کر شام سُندر کے باپ نے اپنی بیٹی کی شادی کی تاریخ مقرر کردی، نسبت پہلے ہی ایک مہاجن کے بیٹے سے طے ہو چکی تھی۔ اس سے شام سُندر بہت پریشان ہوئی۔ ایک طرف حسن کی محبت اس کا دامنِ دل اپنی طرف کھینچتی اور دوسری طرف ماں باپ کی رُسوائی کا خوف اس کی ہمت پست کردیتا، چنانچہ اس نے فیصلہ کیا ۔

مناسب ہے مرے حق میں یہی بات کہ کچھ کھا کر مروں میں تخت کی رات

حسن کو جب شام سُندر کی شادی کی خبر ملی تو تڑپ اُٹھا اور شادی کی رات ۔

بدل کر بھیس وہ بھی گھر میں پہونچا تڑپ کر پہلوئے دلبر میں پہونچا

شادی کی رسمیں شروع ہوئیں اور جب بھانور کی رسم ادا ہونے لگی تو یکایک مکان کے ایک گوشے سے دھواندھار آگ اُٹھی اور دم کے دم میں سارا گھر آتش کدہ بن گیا۔ لوگ اپنی اپنی جان لے کر بھاگنے لگے۔ حسن نے یہ حال دیکھا تو اُسے شام سُندر کی فکر ہوئی چنانچہ وہ کسی طرح اُس کے پاس پہنچ گیا اور اُسے گود میں اُٹھا کر ایک کھڑکی کی راہ صحیح وسالم نکل آیا اور اُس کے بعد اُسے اپنے گھر لے آیا۔ لیکن اُس وقت شام سُندر کا چہرہ فق تھا اور طبیعت مضمحل تھی۔ حسن نے یہ حال دیکھا تو کہا ۔

مرے دل کو ہے تجھ سے الفت پاک ہوس کچھ اور اگر ہو جل کے ہوں خاک
ذرا بجھ جائے آگ اے غیرتِ شمع حواس ان دل جلوں کے ہولیں کچھ جمع
ترے گھر لے چلوں تجھ کو یہاں سے ملا دوں تجھ کو تیرے باپ ماں سے

اور یہ کہہ کر وہ شام سُندر کو اپنے گھر میں رکھ کر اُس کے جلتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں سب لوگ دولھا اور دولھن کے غم میں رو پیٹ رہے تھے اس لئے کہ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ دولہا اور دولہن جل کر خاک ہو گئے۔ یہ حال دیکھ کر وہ پھر اپنے گھر واپس آیا اور شام سندر سے سارا حال بیان کر کے کہا۔

چلو تم کو ملا دوں باپ ماں سے کہیں ٹھنڈے نہ ہوں سوزِ نہاں سے

حسن کی اس بے لوث محبت سے شام سُندر بہت متاثر ہوئی اور اس کے قدموں پر گر پڑی اور کہا کہ بے شک تمہاری محبت سچّی اور پاکیزہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں بھی تمہاری اُلفت میں گرفتار ہو گئی ہوں، پھر اس نے اپنی چادر کے گوشہ کی گرہ کھول کر سنکھیا اس کے سامنے پیش کرتے ہوئے بتایا کہ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ تخت کی رات زہر کھالوں گی لیکن اب جب کہ گھر کو آگ لگ گئی اور اس آگ میں میرا ہونے والا پتی جل مرا اور ساتھ ہی گھر کے کُل لوگ میرے جل مرنے پر یقین رکھتے ہیں تو پھر مجھے اب کوئی خوفِ رُسوائی نہیں۔ اس کے علاوہ تمہارے ساتھ میں اپنے ماں باپ سے جا کر ملوں گی تو پتہ نہیں لوگ کیا گمان کریں گے اور اس سے میرے ماں باپ کی عزّت پر حرف آئے گا، اس لئے میرے حق میں اب یہی بہتر ہے کہ سدا کے لئے تمہاری ہو جاؤں۔

اپنے محبوب کی اس گفتگو کو سُن کر حسن کا دل بھر آیا اور اس نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور دوسرے ہی روز اپنے دوستوں کو بلا کر باضابطہ طور پر اس سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد یہ عاشق و معشوق عرصۂ دراز تک ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے رہے یہاں تک کہ ایک روز حسن اپنے احباب کے ساتھ گنگا پار کر کے چھتر کا میلہ دیکھنے گیا اور کئی روز کے بعد کشتی پر سوار ہو کر جب گھر واپس ہونے لگا تو دریا میں زبردست طوفان آیا اور کشتی اُلٹ گئی، کشتی کے اُلٹ جانے سے کچھ لوگ تو غرقِ آب ہو گئے لیکن حسن کسی طرح بچ گیا۔ وہ موجوں کے ساتھ کچھ دور تک بہتا رہا اور اس کے بعد ایک کنارے لگ گیا۔ اسی اثنا میں لوگوں نے شام سندر کو یہ جانکاہ خبر سنائی کہ کشتی اُلٹ جانے

سے حسن دریائے گنگا میں غرق ہو گیا۔ شام سُندر اس خبر بد کی تاب نہ لا سکی اور غش کھا کر ایسی گری کہ پھر کبھی نہ اُٹھ سکی۔ لوگوں نے اس کی لاش کو دفن کر دیا۔ ادھر حسن صحیح و سلامت گھر واپس آیا تو شام سندر کی موت کی خبر سُن کر تڑپ اُٹھا، اس پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی، کبھی خاک اُڑاتا، کبھی کپڑے پھاڑتا اور بیتابی زیادہ بڑھتی تو قبرستان کی طرف نکل جاتا، محبوب کے مزار سے لپٹا اور اس پر رورو کر چراغ جلاتا، اسی حال میں اس کے شب و روز گذر رہے تھے کہ کچھ لوگوں نے اسے یہ عجیب وغریب اطلاع دی کہ آدھی رات جب گذر جاتی ہے تو گنگا کے اس پار آسمان سے مثل ہودجِ نور ایک چیز اُترتی ہے اور کبھی دریا اور کبھی کچھاروں میں بیتاب پھرا کرتی ہے اور۔

کہاں کس رنگ میں تو اے حسن ہے | یہی اس کی صدائے پُر محن ہے
نکل آئی مری جان آہ کے ساتھ | ترے غم میں اُٹھایا زیست سے ہاتھ
عدم میں بھی کہیں تجھ کو نہ پایا | جدائی کا یہ میں نے داغ کھایا
لگی ہے آگ سینے میں دھواندھار | کلیجے سے دھواں اُٹھتا ہے ہر بار

اسی طرح کچھ دیر وہ چیز اِدھر سے اُدھر پھرتی رہتی ہے اور اس کے بعد آسمان کی طرف اُڑ جاتی ہے۔ یہ سُن کر حسن گھر آیا اور پہلے اپنے گذشتہ حالات قلمبند کئے اس کے بعد دوستوں کو بلایا اور اُن سے کہا کہ آج شب میں سیر دریا کا عزم ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے دوستوں کے ہمراہ کشتی پر سوار ہو کر گنگا کو عبور کیا اور اس کے بعد دوستوں سے کہا کہ مجھے آج آدھی رات کو گنگا کے کنارے ایک عمل کرنا ہے، اس لئے آج یہیں رہوں گا۔ اگر تم لوگوں کو ساتھ دینا منظور ہے تو رہو ورنہ اپنے گھر کی راہ لو، پہلے تو دوستوں نے سمجھا بجھا کر اسے اس فعل سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی استقامت دیکھ کر ان لوگوں نے بھی وہیں بستر جما دیا اور کچھ ہی دیر میں کل لوگ سو گئے لیکن حسن جاگتا رہا یہاں تک کہ آدھی رات گذر گئی اور وہ ہودجِ نور نمودار ہوا اور اس سے یہ صدائے درد انگیز بلند ہوئی۔

نہیں ملتے ہو کیوں کیا کچھ خفا ہو | کہاں تم اے حسن رونق فزا ہو
ہوا کیا غم میں حالِ شام سُندر | نہیں تم کو خیالِ شام سُندر
بجھاتے کیوں نہیں تم آ کے ہیہات | لگی رہتی ہے دل میں آگ دن رات

اس اثناء میں حسن کے احباب بھی بیدار ہو چکے تھے، حسن نے ان میں سے ایک کو اپنی تحریر سپرد کی اور

بیتابانہ اس ہودجِ نور کی طرف بڑھتا چلا گیا اور ۔

پکارا شام سُندر شام سُندر　　حسن میں ہوں پریشاں حال و ششدر

ادھر سے وہ شعلۂ نور بھی لپکا اور آن کی آن میں حسن اس شعلہ کی لپیٹ میں آ گیا۔ اب اس دردخیز قصے کا انجام مثنوی نگار کی زبانی ہی سنئے ۔

ہوا مثلِ پری وہ شعلہ رقصاں　　اُڑا پھر صورتِ تختِ سلیماں

فلک پر چڑھ گیا دم بھر میں سَن سے　　اُٹھایا ہاتھ یاروں نے حسن سے

مثنوی سوز و گداز کا پلاٹ

پلاٹ سے مراد قصے کا وہ خاکہ ہے جو قصہ گو کے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ قصہ گو اس خاکے میں کردار اور مناظر کے ذریعہ رنگ بھرتا ہے۔ قصے میں پلاٹ کی حیثیت جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی سی ہوتی ہے۔

اُردو کی قدیم مثنویوں کے قصے زیادہ تر فارسی کی منظوم اور نثری داستانوں سے ماخوذ ہیں اور جن مثنویوں کے قصے داستانوں سے ماخوذ نہیں ہیں ان میں بھی داستانوں کی سی زنجیری کیفیت نظر آتی ہے۔ ان کی فضا بھی داستانوں سے متاثر نظر آتی ہے لیکن متقدمین میں میرؔ کی اور متاخرین میں نواب مرزا شوقؔ کی مثنویاں اس کلیہ سے مستثنٰی ہیں۔

مثنوی سوز و گداز کا پلاٹ بظاہر میرؔ کی مثنوی شعلۂ عشق کا چربہ نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں ایسی بات نہیں۔ میرؔ نے اپنی مثنوی کے پلاٹ کی بنیاد جس واقعہ پر رکھی ہے اسی واقعہ کو شوقؔ نے بھی اپنی مثنوی کے پلاٹ کی بنیاد قرار دیا ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ میرؔ صرف یہ کہہ کر۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور — نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت سے کس کو ہوا ہے فراغ — محبت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ
عجب کام پٹنے میں اس سے ہوا — عجب اہلِ عالم کو جس سے ہوا

اپنی مثنوی شروع کر دیتے ہیں اور اس کے برعکس شوق قصے کو زیادہ حقیقی رنگ دینے کے لئے مثنوی کے ہیرو حسنؔ کی ایک تحریر پیش کرتے ہیں جسے ہم بجا طور پر اس مثنوی کا پلاٹ کہہ سکتے ہیں۔ یہ تحریر فارسی زبان میں ہے۔

اس تحریر کا اُردو عکس درج ذیل ہے:۔

''اے یارانِ وفا کیش! تم مجھ مصیبت زدہ موسوم بہ محمد حسن کے حالِ زار سے آگاہی

نہیں رکھتے اور اس شعلۂ عشق سے بھی واقف نہیں جس نے میرے سینہ میں آگ لگائی اور میرے کاشانۂ دل کو خاک سیاہ کردیا۔ وہ شمع رُخ جس پر میرا دل پروانہ وار نثار ہوا اور جس نے آخر کار میرے سوگ میں جان دی در حقیقت ایک مہاجن کی بیٹی تھی، اس کا واقعہ پُر سوز اور حسرت ناک ہے۔ ایک روز ساحل دریا پر میں اس سے دوچار ہوا اور تیر عشق جگر میں پیوست ہوگیا، مدّتوں اس کے فراق میں خونِ دل پیتا رہا اور سراسیمہ و بے قرار اِدھر اُدھر کی خاک چھانتا رہا۔ دیدار یار کی خاطر کوچۂ یار میں کبھی مجنوں کی طرح دیوانہ وار گیا اور کبھی جوگیوں کے بھیس میں مستانہ وار پہونچا۔ کبھی برہمنوں کے بھیس میں کتھا خوانی میں مصروف رہا۔ اس طرح شربت دیدار یار سے شاد کام ہوتا رہا۔

جب اس پری وش کا بیاہ (ایک دوسرے شخص سے) ہونے لگا تو ایسی آگ لگی کہ اس کا گھر آتش کدۂ پارس کا نمونہ بن گیا (آگ سے ڈر کر) ہر شخص اپنی جان بچا کر بھاگا اور کسی کو دولہن کی پروانہ ہوئی۔ اس وقت بھیس بدل کر میں بھی اس جگہ موجود تھا، میں نے یہ حادثۂ جگر سوز دیکھا تو اُسے (شام سُندر کو) گود میں اُٹھا کر ایک کھڑکی کی راہ سے باہر آ گیا۔ اور اُسے اپنے گھر لے آیا۔ چوں کہ رات کا وقت تھا اور ہنگامہ برپا تھا اس لئے کسی نے پہچانا اور نہ اعتراض کیا۔ سبھوں نے یہ جانا کہ مہاجن کے گھر میں آگ لگی اور اس کی لڑکی اس آگ میں جل کر خاک ہوگئی۔ چوں کہ میرا عشق پاک تھا اس لئے میں نے چاہا کہ اسے عزّت و آبرو کے ساتھ گھر پہونچا دوں لیکن اس شعلہ رو نے (میرے ارادہ کو سُن کر) ایک آہِ سرد کھینچی اور اپنے گھر جانے کے لئے راضی نہ ہوئی۔ آخر الامر میں نے اسے اپنے نکاح میں لے لیا۔ گذشتہ واقعات کو میں نے اختصار کے ساتھ پیش کر دیا۔ ان واقعات سے میرے احباب میں میر محمد رضا جو اس وقت دہلی میں مقیم ہیں، اچھی طرح واقف ہیں۔ ان سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔

اس زمانہ میں میرا جو حال رہا محتاج بیان نہیں (جس واقعہ کو یہاں پر حذف کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شادی کے بعد حسن اور شام سندر کی زندگی کچھ مدّت تک پُر بہار رہتی ہے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد حسن اپنے دوستوں کے ہمراہ چھتر کا میلہ دیکھنے کے لئے گنگا پار کشتی پر سوار ہو کر جاتا ہے اور کچھ دنوں تک میلے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ واپسی میں کشتی اُلٹ جاتی ہے اور وکچھ لوگ غرق آب ہو جاتے ہیں لیکن حسن کسی طرح سے بچ جاتا ہے۔ اسی اثناء میں شام سندر کو لوگوں نے یہ خبر دی کہ کشتی

کے اُلٹ جانے سے حسن دریا میں غرق ہو گیا۔ اس جانکاہ خبر سُن کر شام سُندر کا انتقال ہو گیا اور لوگوں نے اسے دفن کر دیا۔ حسن گھر پہونچا تو شام سُندر کی موت کی خبر سُن کر اس پر پھر وحشت کا حملہ ہوا اور وہ دیوانوں کی طرح کبھی اپنے محبوب کی قبر پر چراغ جلاتا اور کبھی مزار سے لپٹ کر روتا) اور اب یہ خبر ملی ہے کہ آدھی رات گذر جانے کے بعد ایک شعلہ ہودج کی شکل میں آسمان سے دریا کی طرف اُترتا ہے اور دیر تک سراسیمہ و بے قرار اِدھر اُدھر پھرتا ہے اور نہایت ہی حسرت آمیز اور درد انگیز لہجہ میں مجھے یاد کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس غیرت حور کی روحِ پاک ہے جو ہودجِ نورانی پر سوار ہو کر مجھ زندہ درگور کی تلاش میں آتی ہے۔ افسوس!! کہ میں زندہ ہوں اور عشق کا دعویٰ کرتا ہوں۔ میں نے پختہ ارادہ کیا ہے کہ اس شعلۂ آتشیں سے لپٹ کر اپنی جان اپنے محبوب کے حوالے کر دوں گا اور اس طرح آتشِ شوق کو آب وصال سے بجھاؤں گا۔ لوگوں سے میری درخواست ہے کہ مجھ سوختہ دل کے انجام پر نوحہ و ماتم نہ کریں بلکہ میرے حق میں دعائے مغفرت کریں۔"

مثنویٔ سوز و گداز کا پلاٹ پیچیدہ اور ڈھیلا ڈھالا نہیں ہے بلکہ صاف، سلجھا ہوا اور ساتھ ہی گٹھا ہوا ہے۔ قصے میں عضویاتی تعمیر نظر آتی ہے۔

میرؔ کی مثنوی شعلۂ عشق کا قصہ بہت ہی پتلا ہے اور اس کے برعکس مثنویٔ سوز و گداز کے قصے پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

مثنوی سوز و گداز کے اہم کردار

کردار سے مراد وہ افراد قصہ ہیں جن کے اعمال و افعال اور حرکات و سکنات سے قصہ کا ارتقاء ہوتا ہے۔ مثنوی نگار ان ہی افراد قصہ کے ذریعہ قصہ کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے۔ افرادِ قصہ میں کچھ تو اہم ہوتے ہیں اور کچھ غیر اہم، دراصل قصہ کی تعمیر میں جن افراد کی حیثیت مرکزی ہوتی ہے اُنہیں ہم اہم کردار کہتے ہیں اور جن کی حیثیت عارضی اور وقتی ہوتی ہے اُنہیں غیر اہم کردار کہا جاتا ہے۔

مثنویٔ سوز و گداز کے قصہ کی تعمیر میں حسنؔ اور شام سُندر کے علاوہ حسنؔ کے احباب اور شام سُندر کے باپ کا بھی ہاتھ ہے لیکن ان کے کردار غیر اہم ہیں۔ حسنؔ کے احباب کا جا بجا ذکر ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حسنؔ کے نہایت ہی وفادار دوست تھے جو ہر حال میں حسنؔ کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ رہتے تھے۔

شام سُندر کا باپ ایک 'مہاجن' ہے جسے کتھا کا بہت شوق ہے چنانچہ جب وہ حسن کو برہمن کے بھیس میں دیکھتا ہے اور اس کی عالمانہ گفتگو سے متاثر ہوتا ہے تو اس سے عقیدت کے ساتھ پیش آتا ہے اور اپنے گھر اسے کتھا کی غرض سے لے آتا ہے۔ وہ ایک سیدھا سادھا انسان ہے۔

اس قصہ میں مرکزی حیثیت حسنؔ اور شام سُندر کے کردار کو حاصل ہے، دراصل ان ہی دونوں عاشق و معشوق کے والہانہ عشق کی یہ ایک حسرت ناک داستان ہے جو اوّل سے آخر تک ان کے ذکر سے بھری پڑی ہے۔ جنابِ شوقؔ نیموی نے ان کے کردار نہایت ہی فنکارانہ انداز میں پیش کئے ہیں۔

حسنؔ : مثنویٔ سوز و گداز، لیلیٰ مجنوںؔ اور شیریںؔ فرہاد کی طرح ایک المناک عشقیہ مثنوی ہے اور

حسن اس مثنوی کا ہیرو ہے جس میں ایک روایتی عاشق کی تمام خصوصیتیں موجود ہیں۔ وہ ایک خوش رو اور بے فکر نوجوان ہے جس کے شب و روز عیش و عشرت میں گذرتے ہیں، عظیم آباد کا رہنے والا ہے اور کنارِ آب گنگ سے اکثر لطف اندوز ہوتا ہے۔ ایک روز ساحلِ دریا پر ایک دوشیزہ نظر آتی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی وہ اسے اپنا دل دے بیٹھتا ہے اور روایتی عاشقوں کی طرح فوراً ہی آہ و زاری شروع کر دیتا ہے اس لئے کہ ضبط آہ و فغاں اس کے بس کی بات نہیں۔

حسن کے جذبۂ عشق میں قیسؔ و فرہادؔ کے عشق کی شدّت نظر آتی ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کے پیچھے پیچھے دیوانوں کی طرح چلتا ہے اور جب اس کی محبوبہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے تو اس کے فراق میں اس پر وحشت طاری ہو جاتی ہے اور وہ صحرا کی طرف نکل جاتا ہے۔

حسن ایک شجاع اور بہادر انسان ہے۔ اس قصہ میں اس نے کئی جگہ اپنی جوانمردی کا ثبوت دیا ہے — جب شام سُندر اسے دیوانوں کے حال میں دیکھتی ہے اور غش کھا کر اپنی چھت سے گرتی ہے تو وہ اسے اپنے ہاتھوں پر تھام کر مجروح ہونے سے بچالیتا ہے۔ اسی طرح شام سُندر کی شادی کے روز جب مکان میں آگ لگ جاتی ہے اور ہر شخص اپنی اپنی جان بچا کر گھر سے نکل جاتا ہے تو حسن اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر شام سُندر کی جان بچاتا ہے۔ یہ ایک طرف شام سُندر سے حسن کی سچّی محبت کا ثبوت ہے تو دوسری طرف اس کی بہادری اور شجاعت کی بھی ایک روشن دلیل ہے۔

حسن کو بھیس بدلنے میں مہارت حاصل ہے۔ صحرا میں جب اسے چین نہیں ملتا تو اپنی محبوبہ سے ملنے کے لئے پہلی بار سادھو کے بھیس میں آتا ہے اور دوسری بار ایک برہمن کے روپ میں۔ شام سُندر کے علاوہ اور کوئی نہیں پہچان سکا۔

حسن ایک صاحب علم شخص ہے، وہ کئی زبانیں جانتا ہے اور فن تقریر پر بھی مہارت رکھتا ہے۔ چنانچہ برہمن کے بھیس میں جب وہ رامائن کی کتھا کہتا ہے تو لوگ اس کی فصیح البیانی سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور اسے ایک مہا پنڈت اور شیریں بیان مقرّر سمجھتے ہیں۔

حسن کی محبت میں خلوص اور پاکیزگی ہے۔ وہ جب شام سُندر کو آگ سے بچا کر اپنے گھر لاتا ہے اور اسے کچھ اُداس اور غمگین پاتا ہے تو کہتا ہے۔

مرے دل کو ہے تجھ سے اُلفت پاک　　ہوس کچھ اور اگر ہو جل کے ہوں خاک
ذرا بجھ جائے آگ اے غیرتِ شمع　　حواس ان دل جلوں کے ہولیں کچھ جمع
ترے گھر لے چلوں تجھ کو یہاں سے　　ملادوں تجھ کو تیرے باپ ماں سے
نہ تیری آبرو پر آئے کچھ آنچ　　جبھی ہے عشق صادق کی مرے جانچ

اور یہ کہہ کر وہ تنہا شام سُندر کے جلتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ وہاں اسے معلوم ہوتا ہے کہ دولہا جل کر خاک ہو گیا اور لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ دلہن بھی جل مری۔ یہ خبر وہ شام سندر کو آ کر سُناتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارے ماں باپ تمہارے غم میں رو پیٹ رہے ہیں اس لئے۔

چلو تم کو ملادوں باپ ماں سے　　کہیں ٹھنڈے نہ ہوں سوزِ نہاں سے

حسن کی اس بے لوث محبت سے شام سُندر بہت متاثر ہوتی ہے اور وہ اس کے قدموں پر گر پڑتی ہے اور اپنے ماں باپ کے یہاں جانے سے انکار کر دیتی ہے اور خود کو اس کے سپرد کر دیتی ہے۔ یہاں بھی حسن کا کردار اپنی بلندی پر قائم رہتا ہے۔ وہ شام سندر کو اپنی داشتہ بنا کر نہیں رکھتا بلکہ اس سے باضابطہ طور پر شادی کر لیتا ہے۔

حسن کے عشق میں فرہاد کے عشق کی صداقت نظر آتی ہے۔ جس طرح شیریں کی موت کی خبر سُن کر فرہاد سر پھوڑ کر مر گیا تھا اسی طرح حسن کے غرق آب ہونے کی خبر سے جب شام سُندر کی روح پرواز کر جاتی ہے اور وہ ایک بھڑکتے ہوئے شعلے میں تبدیل ہو کر روزانہ گنگا کی سطح پر اور کچھاروں میں بے تاب پھرتی ہے تو یہ خبر سُن کر حسن گنگا کے کنارے پہونچ کر خود کو اس شعلے کے سپرد کر دیتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

حسن کی سیرت ایک روایتی عاشق کی سیرت ہے اور مثنوی نگار نے اس کی سیرت کو پیش کرنے میں کہیں بھی جدت سے کام نہیں لیا ہے۔

شام سندر : شام سُندر اس مثنوی کی ہیروئن ہے۔ یہ ایک نہایت ہی حسین و جمیل دوشیزہ ہے۔ اس کے حسن کو شاعر نے ایک شعر میں نہایت ہی ایجاز و اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پریوش۔ ماہ سیما۔ مہر طلعت۔ بلا قامت۔ قیامت۔ قہر۔ آفت

اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کو دیکھتے ہی حسن کے ہوش اُڑ جاتے ہیں۔ اور وہ اس کی محبت میں

گرفتار ہو جاتا ہے۔

شام سُندر عظیم آباد کے ایک مہاجن کی لڑکی ہے۔ اس کی صورت کی طرح اس کی سیرت بھی نہایت ہی دلکش ہے، حیا و شرم اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور طبیعت بہت ہی پاکیزہ ہے۔ گنگا کے کنارے اسے دیکھ کر حسن مضطرب و بے تاب ہوتا ہے تو اس کی حرکتوں کو دیکھ کر اسے حیرت ہوتی ہے اور جب حسن کی بے چینی کا باعث اس کی سمجھ میں آجاتا ہے تو شرم وحیا کے بارے اس کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔

شام سندر ایک آبرومند دوشیزہ ہے۔ اسے اپنی عزت و آبرو کا اس حد تک خیال ہے کہ وہ اپنے جذبات کو کچل کر اور حسن کو تڑپتا چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔

شام سندر کی حیاداری کی انتہا یہ ہے کہ خواب میں بھی حسن اسے اسی عالم میں دیکھتا ہے ؎

حسن کے پاس آپہونچی ادا سے مگر نیچی نظر جوشِ حیا سے

اور حسن کو تلقین کرتی ہے کہ ؎

رہے اتنا خیالِ شام سُندر کہ حرف آنے نہ پائے آبرو پر
کبھی لب پر نہ آئے نام میرا کہ ہوگا راز طشت از بام میرا

اسی طرح جب وہ حسن کو ایک دیوانے کی شکل میں دیکھ کر غش کھا کر چھت سے گرتی ہے اور ہوش آنے پر خود کو حسن کی آغوش میں پاتی ہے تو مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتی ہے ؎

پسینا آگیا لوحِ جبیں پر گھٹا سی چھا گئی ماہ مبیں پر
ادا سے آپ کو جھٹ پٹ سنبھالا حیاء و شرم سے گھونگھٹ نکالا

اور یہ شرم وحیاء ہی تھی جس نے شام سُندر کو حسن سے گفتگو کرنے سے اس وقت تک باز رکھا جب تک کہ مکمل تنہائی نصیب نہ ہوئی۔ اس وقت بھی وہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتی ہے۔ حسن کو جوگی کے بھیس میں دیکھ کر اسے اپنے گلے کا ہار دینے کے بعد کہتی ہے ؎

کہاں ہے گھر تمہارا نام کیا ہے یہاں آنا ہوا کیوں کام کیا ہے
کہو سچ سچ کہ ہے کس بات کا روگ لیا ہے تم نے آخر کس لئے جوگ

اور جب حسن اظہار عشق کرتا ہے تو اس کے جواب میں صرف مُسکرا کر رہ جاتی ہے۔

عام ہندوستانی عورتوں کی طرح شام سُندر میں بھی جرأتِ اظہار کا فقدان ہے۔ وہ سماج سے ڈرتی ہے، یہاں تک کہ سماج کے خوف سے اپنے جذبات کا خون تک کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ایک دوسرے شخص سے طے ہو جاتی ہے لیکن وہ خاموش رہتی ہے۔ وہ یہ سوچتی ضرور ہے کہ ؎

نہ دیکھی خواب میں بھی جس کی صورت　　بنے وہ میرے دل کا داغ حسرت
نہیں غیرت یہ کرتی ہے گوارا　　کہ اک ناآشنا ہو خلوت آرا

لیکن پھر بھی وہ خاموش رہتی ہے اس لئے کہ سماج سے خوف کھاتی ہے۔ خود کہتی ہے ؎

اگر اس کا نہ ہوتا کچھ مجھے ڈر　　کہ پھر جائے گا پانی آبرو پر
نکلتی گھر سے مثلِ نکہتِ گل　　میں جاملتی حسن سے بے تأمل

اور مختصر یہ کہ ؎

لحاظ طعن خویش واقربا ہے　　خیالِ این وآں زنجیر پا ہے

اور اس کے بعد وہ ایک شکست خوردہ ذہن کی طرح اپنے کو تسلی دیتی ہے ؎

حسن کا بھی باعث ہے مجھ کو ارماں　　کہ میں ہندو کی لڑکی وہ مسلماں

آخر کار وہ زہر عشق کی ہیروئن کی طرح اس فیصلہ پر پہونچ جاتی ہے کہ ؎

مناسب ہے مرے حق میں یہی بات　　کہ کچھ کھا کر مروں میں تخت کی رات

لیکن اتفاق سے شادی کے روز گھر میں آگ لگ جاتی ہے اور اس آگ میں اس کا شوہر جل مرتا ہے لیکن وہ خود حسن کے ہاتھوں مرنے سے بچ جاتی ہے۔ حسن اس کو پوشیدہ طور پر اپنے گھر لے آتا ہے اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے پتی کے ساتھ جل کر خاک ہوگئی۔ اس موقع سے وہ فائدہ اُٹھاتی ہے چنانچہ حسن جب اسے اس کے ماں باپ کے پاس لے جانا چاہتا ہے وہ حسن کے پاکیزہ جذبات سے متاثر ہوتی ہے اور والدین کے پاس جانے سے انکار کر دیتی ہے اور حسن سے اپنی محبت کا اقرار و اظہار کرتی ہے اس لئے کہ ؎

مرے جلنے کا جب سب کو یقیں ہے　　تو پھر کچھ خوف رسوائی نہیں ہے

اور ماں باپ کے پاس واپس نہیں جانے کی وجہ یہ ہے کہ ؎

تمہارے پاس جب خلوت میں بیٹھی کوئی کیا جانے کس حالت میں بیٹھی
مقرر سب گمانِ بد کریں گے مرے ماں باپ غیرت سے مریں گے

شام سُندر کے عشق میں بھی شدّت اور صداقت ہے۔ وہ جب حسن کے غرق آب ہونے کی خبر سنتی ہے تو اُس کے غم میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردیتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی اسے چین نہیں ملتا اور حسن کے فراق میں ایک شعلۂ جوالہ کی شکل میں زمین و آسمان میں دیوانہ وار پھرتی ہے یہاں تک کہ جب حسن اس سے جاکر مل جاتا ہے تو اسے چین نصیب ہوتا ہے۔

شام سُندر کے کردار میں خودداری ہے اور اس کی سیرت حسن کے مقابلے میں زیادہ دل کش اور جاندار نظر آتی ہے۔

مثنوی سوز گداز میں فضا آفرینی و منظر کشی

قدرت و فطرت کے مناظر کو موثر انداز میں پیش کرنے کو منظر نگاری کہتے ہیں۔ منظر نگاری کا کمال واقعات و کوائف کی فلم بندی ہے یعنی مناظر کی تصویریں اس طرح نظروں کے سامنے آئیں کہ قارئین یہ سمجھیں کہ فلم دیکھ رہے ہیں اور یہ بات اُس وقت ممکن ہو سکتی ہے جب کہ شاعر مناظر کی کل تفصیلات کو دلآویز انداز میں پیش کرے۔

اُردو کے مثنوی نگار شاعروں کو منظر نگاری کا اچھا خاصا ذوق رہا ہے چنانچہ اکثر و بیشتر مثنویوں میں منظر نگاری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

شوقؔ نے اپنے پیش رووں سے استفادہ کیا ہے اور اپنی مثنوی سوز و گداز میں منظر نگاری کی چند عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

شام سُندر گنگا اشنان کے بعد اپنے گیسو کو نچوڑتی ہے تو پانی کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ اس منظر کو یوں پیش کرتے ہیں۔

نچوڑے اس نے جس دم گیسوئے تر ہوا روشن کہ ٹوٹی سلک گوہر

شام سُندر کو اپنی گلی میں ایک دیوانے کی آمد کی خبر ملتی ہے تو اسے شک ہوتا ہے کہ یہ دیوانہ اس کا عاشق حسنؔ ہے۔ اس وقت اسے دیکھنے کے لئے وہ بے تابانہ اپنی چھت کی طرف جاتی ہے لیکن چھت کے قریب پہونچ کر تذبذب کی حالت میں پڑ جاتی ہے۔ کبھی پیچھے ہٹتی ہے اور کبھی آگے بڑھتی ہے یہاں تک کہ جذبِ دل سے مجبور ہو کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے زینے طے کر کے چھت کے اوپر پہونچ جاتی ہے۔ اس حالت کی تصویر دیکھئے۔

بڑھی، جھجکی، ہٹی پیچھے کئی بار چلی پھر جذب دل سے ہو کے ناچار
کبھی اُلجھن، کبھی تھی لغزشِ گام غرض جوں توں کئے طے زینۂ بام

سادھو کے بھیس میں حسن کی تصویر ۔

بھبھوت اس نے ملا باندھا لنگوٹا لیا اک دپینا اور ایک لوٹا
بغل میں مرگ چھالا اک دبایا سراپا سوانگ سادھو کا بنایا

برہمن کا بہروپ ۔

بھرا پھر روپ اک دن برہمن کا جبیں پر قشقۂ خوشرنگ کھینچا
کیا کنٹھی سے سوانگ اپنا نرالا لیا نامِ صنم جپنے کو مالا
حمائل دوش پر زنار ڈالی بغل میں ایک پوتھی بھی دبالی

شام سندر کی شادی کے موقع پر گھر میں آگ لگ جاتی ہے اور ہر شخص اپنی اپنی جان بچا کر بھاگتا ہے۔ اس ہولناک منظر کی تصویر کشی دیکھیے ۔

ہوا آتش کدہ دم بھر میں وہ گھر بنے شہتیر بازوئے سمندر
قیامت کی مچی لوگوں میں ہلچل گرے اک دوسرے پر ہو کے بیکل
کوئی کھڑکی سے نکلا کوئی در سے ادھر سے بھاگ نکلے کچھ اُدھر سے
نہ دولہا کی نہ کچھ پروا دولہن کی پڑی تھی سب کو اپنے جان و تن کی

منظر نگاری میں شوق نسیم لکھنوی کے مقلد نظر آتے ہیں۔ مناظر کی پیش کش میں نسیم ہی کی طرح ایجاز و اختصار سے کام لیتے ہیں اور بعض اوقات نسیم ہی کی طرح مناظر کو تشبیہ و استعارہ کی دھند میں چھپا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر شام سندر کے فراق میں حسن کی حالتِ زار و زبوں ملاحظہ ہو ۔

کبھی اُٹھتا مثالِ دردِ فرقت کبھی وہ بیٹھ جاتا دل کی صورت
کبھی وحشت میں دامن جھاڑتا وہ کبھی جیب و گریباں پھاڑتا وہ
اگر گھبرائے سوئے باغ جاتا برنگِ لالہ دل پر داغ کھاتا
جو سنتا نالۂ پُر دردِ بُلبُل گریباں چاک کرتا صورتِ گُل
نظر آتے نہالِ سرود شمشاد جوابِ نالۂ پا مالِ بیداد
رواں ہر لحظہ اشکِ دیدۂ تر زباں پر شام سندر شام سندر

مثنویٔ سوز و گداز میں فوق الفطرت عنصر

عام طور پر فوق الفطرت عنصر سے جن، دیو، پری اور پرستان وغیرہ مراد لیتے ہیں۔ اردو کے اکثر مثنوی نگاروں نے ان عناصر سے قصے کی تشکیل و تعمیر میں مدد لی ہے۔ شوق کی مثنوی اس قسم کے خرافات سے پاک ہے لیکن اس میں ایک ایسا واقعہ بیان کیا گیا ہے جسے ہم غیر معمولی کہہ سکتے ہیں، وہ یہ کہ موت کے بعد شام سُندر ایک ہودجِ نور پر سوار ہو کر آسمان سے زمین پر اُترتی ہے اور حسن کی جستجو میں ادھر ادھر بے تابانہ پھرتی ہے۔ حسن کو یہ معلوم ہوتا ہے تو خود کو اس شعلہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ واقعہ یقیناً غیر معمولی اور فوق العادۃ ہے لیکن مثنوی نگار نے اس کا جواز ڈھونڈھ نکالا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

''اس دلچسپ مثنوی میں کوئی واقعہ خلاف عقل نہیں مگر صرف یہی ایک ایسا حیرت انگیز واقعہ ہے جس میں شاید لوگوں کو کلام ہو مگر روح کا کسی نورانی شکل میں متشکل ہو کر آنا نہ عرفاً مُستبعد ہے نہ شرعاً بلکہ جو لوگ مسمریزم کے عجائب و غرائب سے کچھ خبر رکھتے ہیں وہ بلا تامل اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ تاہم اگر واقعات پر نظر نہ ہوتی اور معتدّد ثبوت کا لحاظ نہ ہوتا تو نئی روشنی والوں کی خاطر سے ہم اس کو فاسفورس کہہ دیتے مگر ہمیں تو یہی کہتے بنتا ہے کہ سب آتشِ عشق کی حرارت کے نیرنگ تھے۔''

اس کے علاوہ حسن اور شام سُندر کے بے مثال عشق کا یہ اندوہناک قصہ چونکہ حقیقی بتایا جاتا ہے اس لئے مثنوی نگار نے اس کو جوں کا توں پیش کر دیا ہے ساتھ ہی مثنوی نگار نے اس واقعے کو اپنے زورِ قلم سے اس طرح پیش کیا ہے کہ مثنوی میں یہ حقیقی معلوم ہوتا ہے۔

مثنوی سوز و گداز کی شاعرانہ حیثیت اور اُس کے متعلّق تنقیدی رائے

مثنوی سوز و گداز ایک کامیاب المیہ مثنوی کہی جاسکتی ہے۔ جناب شوقؔ نے مثنوی کے مختلف اجزائے ترکیبی کی تنظیم و ترتیب میں بے مثال فنکارانہ صلاحیت سے کام لیا ہے۔ پلاٹ سازی میں اپنی چابکدستی کا ثبوت پیش کیا ہے اور کردار نگاری کے بھی نہایت ہی عمدہ نمونے پیش کیے ہیں خصوصاً شام سُندر کی سیرت کی پیش کش میں بہت ہی سلیقہ مندی سے کام لیا ہے۔ مناظر کی تصویر کشی میں بھی شوقؔ کامیاب نظر آتے ہیں۔ اسلوب بیان میں رنگینی و رعنائی ضرور ہے اور صنعتوں کا استعمال بھی دل کھول کر کیا گیا ہے لیکن شگفتگی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کسی مقام پر بھی اندازِ بیان میں بوجھل پن اور اغلاق نظر نہیں آتا۔ واقعات کے بیان میں بے جا طوالت سے پرہیز کیا گیا ہے اور مناسب ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

مثنوی سوز و گداز کی زبان بہت ہی دل کش، بامحاورہ اور رواں ہے۔ بقول فصاحتؔ لکھنوی ؂

شیریں جو ہے کلام تو کہتے ہیں اہل ذوق — ایسی تو نظم دیکھی نہ ہم نے سُنی کبھی
مضمون، استعارے، مثالیں، محاورے — لطفِ زباں کے ساتھ صفائی بھی نظم کی

مثنوی سوز و گداز حسن و عشق کا ایک درد خیز لیکن نہایت ہی دلچسپ فسانہ ہے اور کمال یہ ہے کہ ابتدا سے انتہا تک یہ دلچسپی قائم رہتی ہے۔ اس مثنوی کی دل کشی کا جادو داغؔ دہلوی کے سر چڑھ کر بھی بولا ہے ؂

مثنوی جس کا نام سوز و گداز — اس سے بہتر نہیں فسانۂ عشق

حضرتِ شوقؔ کی ہے یہ تصنیف باعثِ رونقِ زمانۂ شوق
معدنِ طبع میں ہے گوہرِ عشق مخزنِ دل میں ہے خزانۂ شوق

یکم جنوری ۱۹۸۹ء پروفیسر مظفر اقبال

مثنوی سوز و گداز

مولانا ظہیر احسن شوق نیموی

حمد

مرا پیکِ خیال عرش پیما / سوادِ حمد میں ہے جلوہ فرما
یہی دل میں ہے فکر نکتہ داں کے / کہ تارے توڑ لاؤں آسماں کے
دکھاؤں رفعتِ شیوا بیانی / بنوں شہبازِ اوجِ نکتہ دانی
کروں میں نظم کا رُتبہ دوبالا / کہ ہو ملکِ سخن میں بول بالا
عروجِ شوکتِ طرزِ بیاں ہو / زمینِ شعر رشکِ آسماں ہو
حصولِ فیض ہو روح الامیںؑ سے / مضامیں لاؤں میں عرشِ بریں سے
کروں حمد و ثنائے شاہدِ پاک / گرہ بندِ نقابِ ہفت افلاک
ہر اک شے میں ہے جس کا جلوۂ نور / جلا جس کے فروغِ حسن سے طور
بنائی کہکشاں کی جس نے افشاں / جبینِ ماہ تاباں نور افشاں
محمدؐ سے کہے رازِ نہانی / کلیم اللہ سے کی لَن ترانی
بنایا سیمتن برگِ سمن کو / نزاکت دی عروسانِ چمن کو
کرن کا باندھ کر زرتار سہرہ / غضب چمکا دیا سورج کا چہرہ
دیا سروِ چمن کو سبز خلعت / پنہا یا قمریوں کو طوقِ اُلفت
عنادل کو وہ بخشی آہِ پُردرد / کہ سُن کر غم سے ہو جاتے ہیں گُل زرد

پریشاں کردئے گیسوے سنبل   بنایا سوگوارِ مرگِ بُلبُل
کیا پیراہنِ صد برگ صد چاک   عطا کی ماتمی سوسن کو پوشاک
کئے عالم میں پیدا شادی و غم   دکھایا جلوۂ عید و محرم
ہنساتا ہے کبھی وہ صورتِ گُل   رولاتا ہے کبھی مانند بُلبُل
کہیں ہے عیش و عشرت غم کہیں ہے   کہیں ہے رَت جگا ماتم کہیں ہے
کہیں دولہا کے پہلو میں دولہن ہے   کہیں طیّاری گوروکفن ہے
کہیں داغِ جگر ہے شعلہ انگیز   کہیں ہے آتشِ حسرت شرر ریز
کہیں سوزوگداز شمعِ محفل   کہیں بے تابیِ پروانۂ دل
کہیں روشن چراغِ خانۂ عشق   کہیں آتش فشاں کا شانۂ عشق
نمایاں ہیں غرض قدرت کے نیرنگ   طلسماتِ جہاں سے عقل ہے دنگ
عجب ہے اُس کی شانِ کبریائی   خرد کو بھی ہے عذرِ پارسائی
منزہ شرک سے ہے ذات اُس کی   مُبرا عیب سے ہر بات اُس کی

مناجات عاشقانہ

عطا کر مجکو وہ دل یا الٰہی   جو ہو دمساز آہِ صبح گاہی
ہلا دے آہ سے عرشِ بریں کو   کرے رو رو کے ترفرش زمیں کو
وہ چمکے آفتابِ داغِ اُلفت   خجل ہو جس سے خورشید قیامت
اگر کھینچوں کبھی میں آہِ پُردرد   حسینوں کے رُخِ گلرنگ ہوں زرد
محبت میں وہ چشم خونفشاں دے   کہ قطرہ قطرہ لُطفِ گلستاں دے
ترے جلوے مری آنکھوں میں پھر جائیں   حسینانِ جہاں نظروں سے گر جائیں
مرے دل میں رہے اک تیری اُلفت   نظر آئے مجھے کثرت میں وحدت
بنے پیمانۂ دل جامِ عرفاں   شرابِ معرفت ہو بادۂ جاں

نعت

جو وقتِ ذکر نعتِ مصطفیٰؐ ہے زبانِ خامہ پر صلِّ علیٰ ہے
نہ کیونکر شور ہو صلِّ علیٰ ہے تصوّر ہے جنابِ مصطفیٰؐ ہے
جو محبوبِ خدائے کبریا تھے سراپا مظہر نورِ خدا تھے
قدِ بالا نہالِ باغِ جنّت فدا سو جان سے جس پر قیامت
سوادِ زلف شامِ لیلۃُ القدر جمالِ روئے روشن غیرتِ بدر
نقاطِ خال روئے مہر طلعت سویدائے دلِ حورانِ جنّت
لبِ جاں بخش رشکِ آبِ حیواں خضرؑ بھی سبزۂ خط پر تھے قرباں
دُرِ دنداں درخشاں مثلِ انجم بہارِ صبح اندازِ تبسّم
وہ تھا سیبِ زنخداں روح پرور مَلک صلِّ علیٰ پڑھتے تھے جس پر
گلا تھا یا صراحی نور کی تھی قلم شیشے کی یا بلّور کی تھی
برنگ آئینہ تھا صاف سینہ دُرِ اسرار عرفاں کا خزینہ
جسے کہتے ہیں سب مُہر نبوّت وہ تھی اک خاتمِ گنجِ حقیقت
اب اس سے بڑھ کے کیا کہیے کہ کیا تھے وہ اک آئینۂ وحدت نما تھے
سوئے ہستی ہوئے جب رونق افروز گری ابلیس پر برقِ جگر سوز
چمک اُٹھا یکایک بختِ اسلام زمیں پر گر پڑے مُنھ کے بل اصنام
یہ چھایا رُعبِ حکمِ شاہِ اسریٰ کہ کانپ اُٹھا یکایک قصر کسریٰ
بُراقِ باد پا پر برق آسا زمیں سے پہونچے تا عرشِ معلیٰ
ہوا قربِ خداوندِ دو عالم ہوئے کیا کیا نیاز و ناز باہم
ادب اب مانعِ طولِ سخن ہے خیالِ این و آں مُہرِ دہن ہے

آغاز داستان

ادھر آ ساقیِ میخانۂ شوق　　خراب بادۂ پیمانۂ ذوق
قدح نوشِ مئے عشقِ دل افروز　　کبابِ آتشِ حسن گلو سوز
سرِ خُم سے اُٹھا دے آج سرپوش　　پلادے بادۂ غارتگرِ ہوش
بنے جس طرح جامِ مے پلادے　　اگر کم ہو تو کچھ پانی ملادے
طبیعت میں جو آجائے روانی　　دکھادوں جوشِ دریائے معانی
دہن سے بحر مضموں موجزن ہو　　زباں سرچشمۂ شعر و سخن ہو
کرے کلک آج وہ گوہر فشانی　　کہ ہوں دُرِ عدن بھی پانی پانی
مری فکرِ رسا جوہر دکھائے　　تہِ بحر سخن غوطے لگائے
نکالے سیکڑوں دُرِ مضامیں　　جوابِ آب و تابِ نظم پرویں
چمک اُٹھے مری نظم گہر بار　　ڈھلے ہوں نور کے سانچے میں اشعار
سخن آئینۂ رازِ نہاں ہو　　قبولِ عام اندازِ بیاں ہو
کہوں افسانۂ عشقِ جنوں خیز　　سناؤں داستانِ حیرت انگیز
عظیم آباد میں اک نوجواں تھا　　ریاضِ حُسن کا سروِ رواں تھا
نہالِ بوستانِ عیش و آرام　　گلِ گلزار استغنا حسؔن نام
ہر اک فکرِ جگر فرسا سے بے غم　　شبابِ آرزو سے شاد و خرم
نہ تھا آگاہ جورِ آسماں سے　　نہ واقف لذّتِ دردِ نہاں سے
جو اک دن اُس کی لہرائی طبیعت　　ہوئی دریا کی جانب دل کو رغبت
بڑھا گھر سے برنگِ موجۂ آب　　چلا باہر مثالِ اشکِ بیتاب
جو وحشت میں لبِ ساحل وہ پہونچا　　قدم لینے کو آئی موجِ دریا
نسیمِ صبح نے کی پیشوائی　　برنگِ گل کلی دل کی کھلائی
جو پایا شوقِ دل کا کچھ اشارہ　　ہر اک جانب ہوا محوِ نظارہ

نظر آیا یکایک شورِ محشر
پڑی آنکھ اک بُتِ کافر ادا پر

پریوش، ماہ سیما، مہر طلعت
بلا قامت، قیامت، قہر، آفت

دو زلفیں موبمو شکل سلاسل
خمِ گیسو کمندِ آہوئے دل

قیامت مانگ کی باریک تحریر
رہِ آبِ بقا یا چشمۂ شیر

جبیں یا کوئی ٹکڑا چاند کا تھا
سحاب زلف میں کچھ کچھ چھپا تھا

نگارستان چیں، چین جبیں تھی
خطِ موجِ شرابِ آتشیں تھی

بھویں محراب ایوانِ فرح تھیں
سپہر حسن کی قوس قزح تھیں

جگر دوزِ حسیناں تیرِ مژگاں
اُترتے تھے دلوں میں شکل پیکاں

شرارت مست آنکھوں میں بھری تھی
سبو میں مے کہ شیشے میں پری تھی

نگاہِ چشمِ پُرفن فتنہ پرداز
قدح نوشِ شراب شوخی و ناز

سوجھاتی تھی یہی باریک بینی
کہ شمعِ حسن کی اِک لَو تھی بینی

لبِ شیریں تھے رشکِ شہد و شکر
جوابِ لذّتِ قندِ مکرّر

حلاوت یہ دم شکّر فشانی
بھر آتا زاہدوں کے منھ میں پانی

نظر آتے جو اُس گُل کے کہیں گال
ٹپک پڑتی جناب شیخ کی رال

دہن تھا غنچۂ سربستۂ راز
گُل ۔ عارض بہارِ گلشن ناز

چمک اُٹھتے جو دنداں مثلِ اختر
تو ہو جاتے تھے پانی پانی گوہر

نقاطِ خالِ عارض پیارے پیارے
پری کی پُتلیاں آنکھوں کے تارے

نظر پڑتی اگر سیبِ ذقن پر
غضب کی اُس پڑ جاتی چمن پر

گلا تھا گردنِ مینا کی صورت
برنگِ مے ٹپکتی تھی لطافت

بہارِ سروقد تھی اُٹھتی کوپل
نہالِ نوجوانی کے تھے دو پھل

جو پڑ جاتی نظر لوحِ شکم پر
پھسل کر صاف گر پڑتی قدم پر

سنبھل سکتی نہ تھی جوشِ صفا سے
الگ ہو جاتی تھی ران و ساق پا سے

پتا ملتا نہ کچھ موئے کمر کا
کہ ہم رشتہ وہ تھا تارِ نظر کا

بلائے جاں قیامت خیز رفتار — صدائے صور تھی چھاگل کی جھنکار
کئی ہمجولیاں گرد اُس کے ہمراہ — نظر آتے تھے تارے ہالۂ ماہ
غرض اس شان سے وہ ماہِ کامل — ہوئی رونق دہِ آغوش ساحل
حسن کے اک نظر میں اُڑ گئے ہوش — ہوا دریائے دل میں عشق کا جوش
پریشاں ہو گیا گیسو کی صورت — زمین پر گر پڑا آنسو کی صورت
رہا اُفتادہ شکلِ سایہ دم بھر — مثالِ درد اُوٹھا پھر آہ بھر کر
مگر پھر بے دلی سے تلملایا — زمیں پر ضعف نے آخر بٹھایا
تحیّر سے بنا تصویر بیجاں — سراپا صورتِ آئینہ حیراں
یکایک اُس پری کی لڑگئی آنکھ — جوان خستہ دل پر پڑگئی آنکھ
جو دیکھی اس کی حسرت خیز حالت — ہوئی اک بار بحرِ غرق حیرت
کہا دل میں کہ یہ کیا ماجرا ہے — یہ غم کش کیوں تحیّر آشنا ہے
مگر کچھ سوچ کر شرما گئی وہ — ہوئی آب آب جب تہ پا گئی وہ
حیا سے پھیر لیں آنکھیں اُدھر سے — مگر اک تیرِ غم گذرا جگر سے
ادا سے اُس نے پھر پوشاک اُتاری — رہی زیبِ بدن صرف ایک ساری
نظر آیا تنِ نازک جو عریاں — ہوا جامے سے باہر مہر تاباں
کیا طرّہ بتِ کافر نے اُس پر — کمر تک کھول دی زلفِ معنبر
دکھا کر حلقۂ زلفِ گرہ گیر — کیا پیلِ فلک کو پا بزنجیر
جو دھویا پنجۂ دستِ حنائی — غضب کی آگ پانی میں لگائی
ادا سے دھوکے زلف عنبریں کو — کیا برباد موئے مشک چیں کو
نہانے کو جو دریا میں دَر آئی — حباب و مَوج نے کی جبہہ سائی
ہوئی محوِ نظارہ چشم گرداب — رگِ بسمل بنا ہر موجۂ آب
ہوئی جب غوطہ زن وہ ماہ پیکر — گھڑوں پانی پڑا آبِ گہر پر
نظر آتی تھی یوں وہ رشکِ ناہید — کہ گویا بُرج آبی میں ہے خورشید

نہانے میں جو پھیلے زُلف کے بال
بنے حیوان آبی کے لئے جال

نہا دھو کر نکل آئی بصد آب
چمک کر جس طرح بادل سے مہتاب

سر اپنا رہ گئیں موجیں پٹک کر
بنا دریا سراپا دیدۂ تر

دل گرداب کھا کر داغِ فرقت
بھر آیا دیدۂ عاشق کی صورت

نچوڑے اُس نے جس دم گیسوئے تر
ہوا روشن کہ ٹوٹی سلک گوہر

جو دیکھی زلف تر کی دُرفشانی
ہوا سرچشمۂ خور پانی پانی

نیا جوڑا جو پہنا اُس پری نے
قیامت ڈھائی حُسنِ کافری نے

یہ عالم دیکھ کر اُس سیمتن کا
ہوا قابو سے دل باہر حسن کا

جگر پر ہاتھ رکھ کر کھینچی اک آہ
بتِ کافر کے دل میں جس نے کی راہ

تڑپ اُٹھی رگِ بسمل کی صورت
جگر پر چوٹ کھائی دل کی صورت

سنبھالا کچھ دلِ ناوک نشاں کو
نگاہِ یاس سے دیکھا جواں کو

ہوا ثابت یہ اُس رشکِ قمر پر
کہ مجھ پر مر رہا ہے یہ مقرّر

مری زلفوں کا ہے یہ پا بزنجیر
بنا ہے ناوکِ مژگاں کا نخچیر

اُڑے ہوش اُس کے رنگِ رو کی صورت
اولجھ کر رہ گئی گیسو کی صورت

کبھی دل میں خیالِ آبرو تھا
غمِ رسوائی ہر چار سو تھا

کبھی افسوس حالِ نوجواں پر
تاسّف عاشقِ آشفتہ جاں پر

جو تھیں ہمجولیاں ساتھ اُس پری کے
نہ کچھ سمجھیں کرشمے دلبری کے

وہ یکسر بے خبر اس راز سے تھیں
نہ کچھ واقف نیاز و ناز سے تھیں

نہ تھیں آگاہ عشقِ فتنہ گر سے
کہ اک تیر اور گذرا دو جگر سے

کہا اُس ماہ سے اے شام سندر
بہت دن چڑھ گیا جلد اب چلو گھر

کہا یہ اور اُٹھائے پائے رفتار
چلی ساتھ اُن کے وہ مہ وش بھی ناچار

بڑھی آگے جو اُس آشفتہ جاں سے
تڑپ کر رہ گئی دردِ نہاں سے

ہوا دو اک قدم چلنا بھی مشکل
محبت کھینچتی تھی دامنِ دل

نظر آیا حسن کو جب یہ نیرنگ — رہا پھر کچھ نہ پاسِ عزّت و ننگ
زمیں سے وہ بھی مثلِ گرد اُٹھا — بہت بے تاب شکلِ درد اُٹھا
بگولے کی طرح کچھ خاک اُڑائی — عجب وحشت زدہ صورت بنائی
کمندِ جذبِ اُلفت کی کشش سے — چلا بل کھا کے آخر پیچھے پیچھے
ہوئی گو آشنائے ضبط وہ حور — مگر تھی اضطرابِ دل سے مجبور
نگاہِ یاس سے پھر پھر کے دیکھا — بہانے سے اُسے ہر پھر کے دیکھا
اِدھر وحشت اُدھر وارفتگی تھی — اِدھر حسرت اُدھر دل تفتگی تھی
اِدھر ہر لحظہ جوشِ اشکباری — اُدھر ہر اک قدم پر بے قراری
اِدھر وہ نوجواں کہتا تھا دل میں — پھنسا میں کس بلائے جاں گسل میں
مرا دل آج قابو میں نہیں ہے — جگر کی طرح پہلو میں نہیں ہے
بنا کر تیرِ اُلفت کا نشانہ — مجھے اب کیا دکھاتا ہے زمانہ
اُدھر کہتی تھی وہ زہرہ شمائل — کہ میرا اس طرح کیوں ہوگیا دل
مجھے کیا کوئی شیدائی بنا ہے — بلا سے میری سودائی بنا ہے
کھلائے گا گُل اک دن عشق کافر — اُڑے گی یہ خبر بو ہو کے آخر
نہ ہرگز راز یہ پنہاں رہے گا — سُنے گا جو کوئی وہ کیا کہے گا
کھٹکتی تھی خیالِ این و آں سے — جگر میں تھی خلش وہم و گماں سے
اُلجھتی تھی کبھی کاکل کی صورت — پریشاں تھی کبھی سُنبل کی صُورت
کبھی مثلِ کمر بل کھاتی غم سے — کبھی دم ساز آہِ نیم دم سے
بناوٹ سے کبھی چھل بل کبھی ناز — دکھا دیتی تھی معشوقانہ انداز
جو چلتی تھی کبھی ناز و ادا سے — نمایاں شوخیاں تھیں نقشِ پا سے
کوئی کیا جانے اس ناز و ادا کو — وہی کچھ سمجھے جو عاشق ہوا ہو
غرض اس طرح دونوں غم رسیدہ — رواں تھے مثلِ موجِ آب دیدہ
کہ اتنے میں وہ پہونچی اپنے گھر تک — منوّر ہو گئے دیوار و در تک

سحر سے انتظار اُس ماہ کا تھا
برنگِ چشمِ عاشق دَر کھلا تھا

قدم جو رکھا سنگِ آستاں پر
نظر کی مڑ کے حسرت سے جواں پر

گلے جب مل گئیں دونوں نگاہیں
ہوئیں رُخصت طلب سینے سے آہیں

مگر لوگوں کی غمازی کے ڈر سے
سوئے دَر پھر گئی جھٹ پٹ اُدھر سے

لئے اک داغ پہلوئے جگر میں
دَر آئی حلقۂ آغوشِ دَر میں

اُفق میں ہو گیا خورشید پنہاں
کہ بدلی میں چھپا ماہِ درخشاں

اِدھر وہ نوجوان سینہ افگار
بنا حیرت نمائے نقشِ دیوار

رہا کچھ دیر بے حِس شکلِ تصویر
سر زلفِ دوتا سے پا بزنجیر

جو پھر بھڑکا جنونِ فتنہ ساماں
چلا کوئے صنم سے چاک داماں

کبھی چلتا کبھی وہ لڑکھڑا کر
برنگِ اشک گر پڑتا زمیں پر

تڑپتا تھا کبھی بسمل کی صورت
کبھی اُٹھتا تھا دردِ دل کی صورت

بڑھا جب صدمۂ دردِ جدائی
غضب کی چوٹ پر چوٹ اُس نے کھائی

لہو آخر ہوا دل کیا جگر تک
بڑی مشکل سے پہونچا اپنے گھر تک

جوشِ وحشت

کہاں اے ساقیِ نازک ادا ہے
خبر ہے کچھ کہ میرا حال کیا ہے

تری الفت نے کچھ ایسا ستایا
کہ فرقت میں کلیجہ مُنہ کو آیا

خوش آتی ہے مجھے نرگس نہ سوسن
دُکھا دیتی ہے دل گلگشتِ گلشن

مجھے انکھیلیاں بادِ سحر کی
ہوئی ہیں چٹکیاں دردِ جگر کی

مری آنکھوں سے جاری بحرِ خوں ہے
ترقی پر مرا جوشِ جنوں ہے

صدائے خندۂ چاکِ گریباں
دکھاتی ہے مجھے راہِ بیاباں

مئے گلگوں پلا کچھ ایسی اس دم
بُھلا دے میرے دل سے صدمۂ غم

سناؤں قصۂ دیوانۂ عشق
کہوں نیرنگیٔ افسانۂ عشق

کہ جب پہونچا حسن اپنے مکاں میں
ہوا مصروف فریاد و فغاں میں

کبھی اُٹھتا مثالِ دردِ فرقت
کبھی وہ بیٹھ جاتا دل کی صورت

کبھی وحشت میں دامن جھاڑتا وہ
کبھی جیب و گریباں پھاڑتا وہ

اگر گھبرا کے سوئے باغ جاتا
برنگِ لالہ دل پر داغ کھاتا

جو سُنتا نالۂ پُر دردِ بُلبُل
گریباں چاک کرتا صورتِ گُل

نظر آتے نہالِ سرود شمشاد
جوابِ نالۂ پامالِ بیداد

رواں ہر لحظہ اشکِ دیدۂ تر
زباں پر شام سندر شام سندر

اعزا نے جو دیکھا اُس کا یہ رنگ
تو سمجھے جوشِ وحشت کا ہے نیرنگ

جنوں اُس کا یہ آخر رنگ لایا
لہو لینے کو اک فصّاد آیا

ہوئی تدبیر گو اصلاح خوں کی
رہی پھر بھی وہی حالت جنوں کی

نہ جب یاروں سے کچھ بن آئی تدبیر
کیا اُس ناتواں کو پا بزنجیر

کئے ہر چار جانب گھر کے در بند
مثالِ مرد مک رکھا نظر بند

خیالی کھینچ کر تصویرِ دلبر
وہ یوں کہنے لگا اک رات رو کر

تجھے اے شام سندر کچھ خبر ہے
کہ میرا حال کیا شام و سحر ہے

محبت میں تری کیا آفت آئی
ترے غم میں کڑی کیسی اُٹھائی

ترے الفت میں دیوانہ بنا میں
جہاں میں ننگِ افسانہ بنا میں

لہو میرا ہوا کچھ نذرِ نشتر
بہا کچھ چشم تر سے اشک ہو کر

اسیرِ زلف پُرخم ہے وہاں دل
لیا ہے پاؤں میں بندِ سلا سِل

تری چھل بل نظر میں پھر رہی ہے
برابر برق دل پر گر رہی ہے

وہ چلنا ناز سے دامن اُٹھا کر
بپا کرتا ہے دل میں شورِ محشر

کبھی ہے ہاتھ پیوندِ گریباں
کبھی ہے شغل چاکِ جیب و داماں

جو گھر تھا بزمِ جاودانہ
ہوا ہے میرے حق میں قید خانہ

یہ کہتے کہتے آخر سو گیا وہ
رہا بندِ الم سے ہو گیا وہ

رہا کچھ دیر تک جب محوِ آرام
نظر آئی یکایک وہ گل اندام

حسنؔ کے پاس آپہونچی ادا سے
مگر نیچی نظر جوشِ حیا سے

ہوا جس دم شرف اندوزِ دیدار
بنا پروانۂ شمعِ رُخِ یار

اک آہِ نیم کش کھینچی جگر سے
نکل آئے کچھ آنسو چشم تر سے

بھر آیا اُس پری کا دل جو غم سے
وہ آنسو گوشۂ دامن سے پونچھے

کہا پھر اے گرفتارِ مصیبت
اسیر حلقۂ زنجیرِ وحشت

فدا جب سے کہ تو مجھ پر ہوا ہے
مرا دل آپ سے باہر ہوا ہے

جدائی میں جو تو نے آہ کی ہے
سِناں سی میرے دل میں راہ کی ہے

تڑپتی ہوں میں دن رات اپنے گھر میں
غضب کی ہوک اٹھتی ہے جگر میں

مگر یہ کیا ترے دل میں سمائی
کہ مجھ سے ہے خیالِ آشنائی

کبھی یکجا ہوئے ہیں کفر و اسلام
ملی ہے صبح روشن سے کہیں شام

رہے اتنا خیالِ شام سُندر
کہ حرف آنے نہ پائے آبرو پر

بنے جس طرح ضبطِ نالہ کرنا
نہ بھولے سے بھی آہِ سرد بھرنا

کبھی لب پر نہ آئے نام میرا
کہ ہوگا راز طشت ازبام میرا

شگوفہ پھر یہ چھوڑا اُس پری نے
کھلایا گل بہارِ دلبری نے

کہ عاشق کے گلے میں ڈال کر ہاتھ
کہا رو رو کے آہِ سرد کے ساتھ

خدا حافظ ترا جاتی ہوں اب گھر
مرے غم میں نہ کرنا حال ابتر

مگر دل سے نہ مجھ کو بھول جانا
کسی گُل پر نہ ہرگز پھول جانا

یہ کہہ کر ہوگئی غائب نظر سے
ہوئی اوجھل نگاہ چشم تر سے

ہوئی دم میں ہَوا وہ صورتِ بو
پری تھی ہو گئی آخر اوڑنچھو

حسنؔ نے خواب میں اک چوٹ کھائی
جگر تڑپا کڑی دل نے اُٹھائی

کھلیں آنکھیں تو دل بیتاب پایا
وہ جلوہ اک خیال و خواب پایا

کبھی وہ جانبِ در دیکھتا تھا
کبھی حسرت زدہ گھر دیکھتا تھا

تقاضائے جنوں تھا گھر سے چلیے
گریباں پھاڑ کر باہر نکلیے

برنگِ نکہتِ زلفِ پریشاں
جنوں میں لیجیے راہِ بیاباں

بہت پڑتی رہی گو پاؤں زنجیر
گریباں بھی ہوا طوقِ گلوگیر

مگر سر دھڑ سے دے مارا زمیں پر
گلال اُڑنے لگا لوحِ جبیں پر

لہو سر سے بہایا فصد کھولی
جنوں نے خوب کھیلی اس سے ہولی

اَحبّا کو نظر آیا جو یہ رنگ
ہوئے غنچے کی صورت غم سے دل تنگ

کہا جب اس کا یہ حالِ زبوں ہے
تو پھر بیکار تدبیر جنوں ہے

رہے گا بند اگر یہ صورتِ دَر
تو مر جائے گا اک دن سَر پٹک کر

مناسب ہے خدا پر چھوڑ دینا
ہر اِک بند سلاسل توڑ دینا

ہوا جب اتفاقِ رائے احباب
کڑی توڑی کیا وا حلقۂ باب

جذبۂ عشق

پلا ساقی مئے گلرنگ مجھ کو
دکھا پھر جلوۂ نیرنگ مجھ کو

جمالِ دخترِ رز کا ہوں مشتاق
کہاں تک صبر طاقت ہو گئی طاق

پلا وہ بادۂ پُر جوش مجھ کو
کہ پھر پہروں نہ آئے ہوش مجھ کو

بہارِ کیف صہبا گل کھلائے
عروجِ نشۂ مے رنگ لائے

طبیعت میں مئے مضموں کا ہو جوش
سناؤں حالِ مردِ خود فراموش

کہ جب چھوٹا حسن بند گراں سے
مثالِ آہ نکلا اس مکاں سے

رہا مثلِ غبارِ دشتِ برباد
جگر میں داغ لب پر شور فریاد

ہوا جس دم گریبان سحر چاک
چلا کوئے صنم کو وہ جگر چاک

لبوں پر شکوۂ نیرنگ تقدیر
زباں منّت کشِ آہِ گلوگیر

شکستِ رنگ عارض وحشت انگیز
صدائے نالۂ دل درد آمیز

جنوں میں خاک اُڑاتا تھا جو اکثر
پڑے تھے کچھ خس و خاشاک سر پر

وہ جب پہونچا قریبِ قصرِ دلدار
جگر سے کھینچی اک آہِ شرر بار

ادب سے صورتِ دامن قدم پر
گرے طفلِ سر شکِ دیدۂ تر

بڑھے پا بوس کو تارِ گریباں
جھکا تعظیم کو ہر چاک داماں

بنا وہ کوچۂ آشوب پرور
ہجومِ خلق سے میدانِ محشر

نظر آئے جو آثارِ شرافت
ہوئی آئینہ ساں ہر اک کو حیرت

تعجب سے یہ پوچھا نام کیا ہے
کہاں ہے گھر تمہارا کام کیا ہے

لبوں پر شکوۂ بے داد کیوں ہے
زباں منّت کشِ فریاد کیوں ہے

ہوئے کیوں ہاتھ مشتاقِ گریباں
کتاں کی طرح کیوں ہے چاک داماں

بہا ہے خون کیوں لوحِ جبیں پر
شفق پھولی ہے کیوں ماہِ مبیں پر

جنوں پرور ہے کیوں صورت تمہاری
ہوئی ہے کب سے یہ حالت تمہاری

کہا اس نے کہ ننگ خانماں ہوں
غبارِ کوچۂ آہ و فغاں ہوں

جنوں سے ہو رہا ہوں آج کل تنگ
دکھاتا ہے زمانہ اپنے نیرنگ

نہ غربت کا الم پروا نہ گھر کی
خبر ہے پاؤں کی مجھ کو نہ سر کی

جو چاہا کھولے رازِ حیرت آگیں
ہوا مُہرِ دہن وہ خوابِ دوشیں

جو گھر میں یہ خبر اس بت کے پہونچی
پڑی ہر اک کے دل میں کھلبلی سی

کوئی باہر ہوئی در سے نکل کر
کوئی چھت کی طرف دوڑی سنبھل کر

جو دیکھا شام سندر نے یہ عالم
اُٹھی بَل کھا کے مثلِ زُلفِ پُرخم

کہا لوگوں سے یہ کیا ماجرا ہے
کہو سچ مچ کہ آخر بات کیا ہے

کوئی بولی گلی میں اک جواں ہے
سراپا شکل شاخِ زعفراں ہے

فغان نیم کش پر لب ہٹے ہیں
پریشاں بال ہیں کپڑے پھٹے ہیں

وہ ہے گو مبتلائے رنج و آفت
مگر صورت سے پیدا ہے شرافت

جنوں نے اس کو دیوانہ کیا ہے
گُہر کو خاکِ ویرانہ کیا ہے

یہ سُنتے ہی ہوا دل اس کا دھک سے
ہوئی کاوش جگر میں وہم و شک سے

خیال عاشقِ ناشاد آیا
وہ ناکام تمنا یاد آیا

بڑھی جھجکی ہٹی پیچھے کئی بار
چلی پھر جذبِ دل سے ہو کے ناچار

کبھی اُلجھن کبھی تھی لغزشِ گام
غرض جوں توں کئے طے زینۂ بام

ہوئی جب جلوہ گر وہ ماہ چھت پر
قدم لینے کو دوڑا مہرِ انور

بر آئے مدعائے دل کرن کے
لئے بوسے لب و خال و دہن کے

نظر آئی جو وہ جامے سے باہر
اوڑھائی دھوپ نے زر تار چادر

جو مثلِ آفتاب آئی لبِ بام
نظر آیا ہجومِ غم سے دن شام

مِلیں آنکھیں جو اُس تصویرِ غم سے
ہوئی بیکل وہ بُت درد و الم سے

جو دیکھی اُس کی حالت ٹوٹی پھوٹی
درا کی طرح چھاتی غم سے کوٹی

نگاہِ عاشقِ مہجورِ ناکام
ہوئی حسرت سے پا بوسِ لبِ بام

ہوا بیخود جو دیکھا جلوۂ یار
گری بجلی جب آنکھیں ہو گئیں چار

ادھر نکلی حسنؔ کے دل سے اک آہ
ہوئی بیچین اُدھر وہ غیرتِ ماہ

محبت کی لگی اک چوٹ دل پر
تڑپ کر رہ گئی وہ حور پیکر

جو چھیڑا اُس کو فرطِ ناخوشی نے
لیا آغوش میں آخر غشی نے

گری چھت سے یکا یک وہ دل آرا
ہوا روشن کہ ٹوٹا کوئی تارا

کھڑا تھا وہ جوانِ خود فراموش
لپک کر لے لیا پھیلا کے آغوش

جو گردِ ماہ ہالہ بن گئے ہاتھ
زمیں پر گر پڑے غش کھا کے اک ساتھ

سیہ زلفیں بکھر آئیں جو رُخ پر
چھپا دامانِ شب میں مہرِ انور

بہم تھا ارتباطِ گبر و دیندار
بنی تھی رشتۂ تسبیح زنار

زمیں پر یوں وہ مشتاقِ اجل تھے
کہ گویا شوق میں دست و بغل تھے

یہ عالم دیکھ کر اک خلق ٹوٹی
قلق میں بال نوچے چھاتی کوٹی

کسی نے سر ہجومِ غم سے پیٹا
کسی نے دے دیا پانی کا چھینٹا

رہے کچھ دیر تک دونوں ہم آغوش
بڑی مشکل سے پھر آیا انہیں ہوش

ہجومِ خلق و شورِ نوحہ گر سے
اُٹھے گھبرا کے خاکِ رہگذر سے
ہوا دل میں جو خوفِ بدگمانی
ہوئی وہ حور پیکر پانی پانی
پسینا آگیا لوحِ جبیں پر
گھٹا سی چھا گئی ماہِ مبیں پر
ادا سے آپ کو جھٹ پٹ سنبھالا
حیاء و شرم سے گھونگھٹ نکالا
پکڑ کر ہاتھ پھر اس نیم جاں کے
گلی سے لائے لوگ اندر مکاں کے
حسنؔ اُٹھا جو دردِ آہ بن کر
رہا استادہ میلِ راہ بن کر
حقیقت سے نہ تھا کوئی بھی آگاہ
نہ سمجھے یہ کہ دل کو دل سے ہے راہ
کوئی بولا جھپٹیا ہو گیا کیا
ہوا دھوکا کسی کو چشمِ بد کا
کوئی بولا کہ وہ دیوانۂ زار
نظر آیا ریشاں زیرِ دیوار
نہیں دیکھا گیا وہ حال جاں کاہ
زمیں پر گر پڑی غش کھا کے ناگاہ
اُدھر وہ حیرت آگیں گفتگو تھی
ادھر نادم حسنؔ کی آرزو تھی
جو سوچا اپنے دل میں وہ دلِ افگار
ٹھہرنے میں ہے اب رسوائی یار
ہوا آندھی وہاں دم بھر نہ ٹھہرا
بگولے کی طرح لی راہِ صحرا

نیرنگِ گدائی

یہ پردہ ساقیِ مئے نوش کب تک
رہے گی دُختِ رزر و پوش کب تک
گدائے کوچۂ پیرمغاں ہوں
خرابِ بادۂ اُلفت نشاں ہوں
تری بھٹی رہے آباد داتا
فقیروں کا بھی دل کر شاد داتا
مرے لب سے لبِ ساغر ملا دے
اچھوتا بادۂ گلگوں پلا دے
چڑھے نشہ جو صہبائے سخن کا
کہوں افسانۂ دل کش حسنؔ کا
فراقِ یار میں وہ خود فراموش
برنگِ بوئے گُل تھا خانہ بردوش
پڑے تلوے میں چھالے پاؤں پھولے
گلے اُٹھ اُٹھ کے ملتے تھے بگولے
رُلاتی دن کو یادِ روئے روشن
خیالِ زلف میں شب بھر تھی اُلجھن

مہِ نو سے نظر اُس کی جو لڑتی
جگر پر عشق کی تلوار پڑتی
فلک پر جب نظر آتے تھے تارے
اوبل پڑتے تھے آنسو غم کے مارے
خیالِ گوہرِ دنداں میں روتا
رُخِ گلگوں سے گردِ راہ دھوتا
قدم لیتے تھے جب خارِ مغیلاں
دُکھا دیتی دل اس کا یادِ مژگاں
کبھی ہم شکل گردِ کارواں تھا
کبھی ہم جادۂ ریگِ رواں تھا
کبھی تھا اپنی قسمت پر وہ نازاں
کہ ہے مجھ پر نگاہِ لطفِ جاناں
یہ کب اُمید تھی آہِ رسا سے
ملائے گی مجھے اُس مہ لقا سے
کہاں وہ گل کہاں خارِ بیاباں
کہاں ذرّہ کہاں خورشید تاباں
کرشمے دیکھیے فضلِ خدا کے
ملایا یار سے بیخود بنا کے
ہم آغوشی ہوئی در پردہ حاصل
خدا کا شکر دل سے مل گیا دل
جو یاد آتی بہارِ کوئے جاناں
بگولے کی طرح ہوتا وہ رقصاں
رہا چندے یونہیں وہ غم کا مارا
یکایک جوشِ اُلفت نے اُبھارا
ہوا دامن کشِ دل شوقِ دیدار
چلا بیتاب سوئے کوچۂ یار
ہوئی جب شہر کے اندر رسائی
فقیرِ مست کی صورت بنائی
بھبھوت اس نے ملا باندھا لنگوٹا
لیا اک دہپنا اور ایک لوٹا
بغل میں مرگ چھالا اک دبایا
سراپا سوانگ سادھو کا بنایا
گُہر تھا خاک میں یا راکھ میں نور
شبِ تاریک میں یا شمعِ کافور
محبت میں بدل ڈالا جو وہ روپ
نہ دیکھی چھاؤں پھر اُس نے نہ کچھ دھوپ
ہوا جب چترِ سر خورشید تاباں
چلا کوئے صنم کو وہ پُرارماں
تمنائیں دلِ مدہوش میں تھیں
اُمنگیں ہر قدم پر جوش میں تھیں
قدم رکھا جو کوئے دل رُبا میں
پڑی ہلچل ہجومِ مدّعا میں
ترقی پر ہوئی بیتابیِ دل
ہوا پیدا جوابِ رقصِ بسمل
ہوا جب آستاں بوسِ درِ یار
فقیرانہ صدائیں دیں کئی بار

کہا بھگوان کی تم پر دیا ہو ‌ ‌ کرو کچھ دان داتا کا بھلا ہو
وہاں جو لوگ چھوٹے یا بڑے تھے ‌ ‌ بجی تھی دوپہر غافل پڑے تھے
مگر بیدار تھی اک شام سندر ‌ ‌ نہ کل پڑتی تھی اُس کو غم سے دم بھر
ہمیشہ وہ خیالِ نوجواں میں ‌ ‌ بسر کرتی تھی درپردہ فغاں میں
نہ مونس تھا کوئی اس کا نہ محرم ‌ ‌ فقط تھی ایک آہِ سرد ہمدم
گلی کے سامنے کوٹھے پر اکثر ‌ ‌ رہا کرتی تھی وہ خورشید پیکر
صدائے بینوا کی چوٹ کھائی ‌ ‌ اکیلی شوق میں چھجے پر آئی
جو دیکھا غور سے اس نوجواں کو ‌ ‌ تو پایا عاشقِ شوریدہ جاں کو
وہ غمکش محو تھا اپنی صدا میں ‌ ‌ فقیر مست کی دل کش ادا میں
جو اُس بُت نے یہ کیفیت نظر کی ‌ ‌ کہ ہے اُس بے خبر کو تاک دَر کی
گلے کا اپنے پھینکا جھٹ سے مالا ‌ ‌ دیا داتا نے سونے کا نوالا
حسن نے سوئے یار آنکھیں اُٹھائیں ‌ ‌ نگاہیں بہرِ استقبال آئیں
گلے نظریں ملیں فرطِ طرب سے ‌ ‌ جھکی پھر گردنِ تسلیم ادب سے
اُٹھا کر اس جواں نے پھر وہ مالا ‌ ‌ مسرت سے گلے میں اپنے ڈالا
برنگِ صوفیِ سرمستِ عرفاں ‌ ‌ رہا وہ وجد میں کچھ دیر رقصاں
ملا انمول مالا بخت جاگا ‌ ‌ ہوا دیدار سونے میں سہاگا
ہوئے پھر دونوں سرگرمِ نظارہ ‌ ‌ ترقی خواہِ احسانِ اشارہ
ہوئیں چشمِ سخن گو سے جو باتیں ‌ ‌ محبت کو ملیں در پردہ گھاتیں
جو پائی وہ گلی غیروں سے خالی ‌ ‌ نگاہِ شوق نے حسرت نکالی
ہوئے پھر آشنا لطفِ سخن سے ‌ ‌ یہ پوچھا شام سندر نے حسن سے
کہاں ہے گھر تمہارا نام کیا ہے ‌ ‌ یہاں آنا ہوا کیوں کام کیا ہے
کہو سچ مچ کہ ہے کس بات کا روگ ‌ ‌ لیا ہے تم نے آخر کس لئے جوگ
کہا چھوٹی پٹن دیوی مکاں ہے ‌ ‌ حسن ہے نام کام آہ و فغاں ہے

تری اُلفت میں سودائی بنا میں		غبارِ کوئے رسوائی بنا میں
جنوں میں پھاڑ کر جیب و گریباں		بنا میں ذرّۂ ریگِ بیاباں
رہا آوارہ مثلِ نکہت گل		پریشاں صورتِ گیسوئے سنبل
بنی گردِ بیاباں غازۂ رُو		ہوئے پابوسِ داماں ڈھل کے آنسو
نظر آیا جو یہ نیرنگِ تقدیر		کیا یاروں نے مجھ کو پابزنجیر
کئی دن تک مجھے رکھا نظر بند		ہوا لیکن جنونِ عشق دہ چند
نہ راس آئی اُنہیں تدبیر میری		تھکی سر مار کر زنجیر میری
اُٹھایا ہاتھ سب نے مجھ سے ناچار		اُتاری میری زنجیر گرانبار
کٹی بیڑی ہوئی میری رہائی		مبارک باد دینے وحشت آئی
ترے دیدار کی حسرت میں اے جاں		ہوا میں پھر غبار آسا پریشاں
کبھی نالہ کبھی آنسو بنا میں		کبھی مجنوں کبھی سادھو بنا میں
سُنی جب شام سندر نے یہ تقریر		ہوئی منّت کشِ آہِ گلوگیر
کچھ آنسو دیدۂ گریاں سے ٹپکے		بخارِ دل سرِ مژگاں سے ٹپکے
کہا اے خاک بیزِ کوچۂ غم		اسیر حلقۂ گیسوئے پُر خم
جو میں اشنان کو گنگا گئی تھی		تجھے خود گم جبھی میں پا گئی تھی
نجانے پڑھ دیا کیا تو نے انچھر		مرا دل ہو گیا قابو سے باہر
غضب ہے پُر اثر ظالم تری آہ		کہ پتھر کے بھی دل میں کرتی ہے راہ
میں واری تیری آہِ آتشیں پر		گرایا مجھ کو کوٹھے سے زمیں پر
حسن نے جب سُنی اُس کی یہ تقریر		کہا شرما کے میری کیا ہے تقصیر
یہ جلوے عشق کے اے دلستاں ہیں		محبت کی یہ سب نیرنگیاں ہیں
یہ سُن کر شام سندر مُسکرائی		دلِ عاشق پر اک بجلی گرائی
نیاز و ناز کا تھا گرم بازار		کہ اتنے میں ہوئے کچھ لوگ بیدار
ہوئی گھبرا کے رخصت وہ گل اندام		اُفق میں چھُپ گیا مہرِ لب بام

حسن بیکل ہوا شامِ الم سے
اندھیرا چھا گیا آنکھوں میں غم سے
اُٹھا پہلو میں دردِ ہجراں کاہ
جگر پر ہاتھ رکھ کر گھر کی لی راہ
تڑپ کر رہ گئی یوں شام سُندر
کہ بجلی جس طرح بدلی کے اندر

رامائن سبھا

غضب دلکش ہے ساقی مے کی بو باس
بدل کر بھیس آیا ہوں ترے پاس
اگر پردہ کھلا دشوار ہوگا
گلے کا میرے قاضی ہار ہوگا
چھپا کر کچھ مے گلگوں پلادے
برنگِ گل کلی دل کی کھلا دے
حسن کا پھر جو بھڑکا شوقِ دیدار
ہوا منّت کشِ نیرنگِ افکار
وہ پُرفن جانتا تھا خوب بھاکا
کسی پنڈت سے سیکھا ڈھب کتھا کا
بھرا پھر روپ اک دن برہمن کا
جبیں پر قشقۂ خوش رنگ کھینچا
کیا کنٹھی سے سوانگ اپنا نرالا
لیا نامِ صنم جپنے کو مالا
حمائل دوش پر زنّار ڈالی
بغل میں ایک پوتھی بھی دبالی
چھپا یوں کفر کی ظلمت میں اسلام
کہ گویا دن نے پہنا جامۂ شام
بدل کر بھیس سوئے[1] چوک آیا
کبت سے ایک عالم کو لبھایا
جہاں تھا رونق افزا وہ پرارمان
وہیں تھی باپ کی اُس گل کے دُکان
جو دیکھی اُس نے وہ گوہر فشانی
بیاں میں وہ فصاحت وہ روانی
یہ سمجھا اپنے دل میں وہ مہاجن
کہ ہے بے مثل پنڈت یہ برہمن
کہا کیا نام ہے بولا پرسرام
جو گھر پوچھا تو کاشی جی لیا نام
وہ بولا جوڑ کر ہاتھ اے مہاراج
ہمارے گھر میں کرپا کیجئے آج
کیا ظاہر میں پہلے اس نے انکار
ہوا راضی بڑھا جب حد سے اصرار

---

[1] جو لفظ ہندی علم ہو یا جس کی فارسی مشہور نہ ہو اس کو ترکیب فارسی استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ بحث یادگارِ وطن میں بسط کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ ۱۲ع

مہاجن نے سر آنکھوں پر بٹھایا
سرِ شام اس کو اپنے گھر لے آیا

ادا کی خوب رسمِ مہمانی
کیا ممنونِ لطفِ قدر دانی

ہوا اس گھر میں یوں وہ جلوہ افگن
میانِ دَیر جیسے شمعِ روشن

مہاجن نے ادب سے التجا کی
کہ ہم لوگوں کی خواہش ہے کتھا کی

بنے خاکِ قدم آنکھوں کا تارا
رہے کچھ روز روشن گھر ہمارا

پھڑک کر بول اُٹھا پھر یوں پرس رام
کہ بہتر پنڈتوں کا ہے یہی کام

نہیں پھولا سمایا وہ مہاجن
سجا پھولوں سے گھر مانند گلشن

ہجومِ خلق و جوشِ سامعیں سے
ہوا اک حشر برپا اُس زمیں سے

چڑھا جب بیاس گدی پر پرس رام
زباں پر رام دل میں حق کا تھا نام

کسی نے پاؤں چومے سر جھکایا
کسی نے ہار پھولوں کا پہنایا

کہ اتنے میں پری چہم شام سُندر
ہوئی داخل سبھا میں حور بن کر

نظر نیچی کئے پہونچی حیا سے
لئے کچھ ہار ہاتھوں میں ادا سے

نہ تھی آگاہ یہ میرا حسن ہے
نہفتہ خاک میں دُرِّ عدن ہے

ادب سے پاس آکر سر جھکایا
قدم کو اُس کے آنکھوں سے لگایا

اُٹھا کر سر جو پہنایا اُسے ہار
ہوئی حیرت جب آنکھیں ہو گئیں چار

لڑی قسمت بنا تقدیر کا کھیل
منڈھے باغِ تمنّا کی چڑھی بیل

ملا جو لطف کوئی کیا بتائے
وہی سمجھے جو دل پر چوٹ کھائے

اِدھر گھونگھٹ میں بیٹھی شام سُندر
اُدھر پنڈت نے کھولا اپنا دفتر

پڑھی تلسی کی رامائن کتھا میں
دکھایا زورِ علم اپنا سبھا میں

کہیں تھی دھوم شعرِ فارسی کی
کہیں تھا لطفِ نظمِ بالمیکی

فصاحت لوٹ تھی حسنِ بیاں پر
تصدق گفتگو لطفِ زباں پر

بچا کر آنکھ وہ ہنگامہ افروز
جمالِ یار سے تھا بہرہ اندوز

کیا جب اس نے ذکرِ حسنِ سیتا
سنایا شام سُندر کا سراپا

جو عشقِ رامؔ کا نقشا اُتارا   کہا درپردہ اپنا حال سارا

پتے کی بات پا کر شام سندر   ادا سے مسکرا دیتی تھی اکثر

پھڑک اُٹھے وہاں جو ہمنشیں تھے   فدائے طرزِ دلکش سامعیں تھے

رہا چندے یونہی ہنگام افروز   کتابِ عشق کا تھا درس ہر روز

ہوئی جب ختم رامائن کتھا میں   ہوا غُل آفریں کا اس سبھا میں

جو دیکھا اب ٹھہرنے میں ضرر ہے   کیا ظاہر کہ کل عزمِ سفر ہے

بہت روکا کیا لوگوں نے افسوس   گئے ناچار گھر ہوکر قدم بوس

کمر باندھی ہوئی جب صبح روشن   ہوا حاضر ادب سے وہ مہاجن

بہانے سے قدم پر شام سُندر   گری مانند اشکِ دیدۂ تر

دمِ رخصت ہوا دیدار حاصل   کھلا بادِ طرب سے غنچۂ دل

چلا ہو کر نہال اُس دلستاں سے   نسیمِ صبح نکلی بوستاں سے

سامانِ عروسی

چمن میں آئی ہے ساقی بہار آج   ترنّم ساز ہیں کیا کیا ہزار آج

پپیہے عشق کا دَم بھر رہے ہیں   غضب مُرغِ چمن کے چہچہے ہیں

نسیمِ صبح مشاطہ بنی ہے   بہارِ سبزۂ و گل دیدنی ہے

ہزاروں خوشنما پھولوں کے گہنے   عروسِ باغ نے بن ٹھن کے پہنے

تبسم ریز ہر گُل کی کلی ہے   مسّی سوسن نے ہونٹوں پر ملی ہے

بہارِ لالہ و سرو و سمن ہے   کوئی دولہا کوئی ان میں دولہن ہے

نہیں پھولے سماتے ہیں نہال آج   ہر اک نخلِ گلستاں ہے نہال آج

صبا کا اوج پر بختِ رسا ہے   چمن عطرِ عروسی میں بسا ہے

یہ ہے ہنگامِ لُطفِ دور ساغر   چھکا دے بادۂ گلگوں پلا کر

مری آنکھوں میں پھولے آج سرسوں   سماں جس کا نہ بھولے مجھ کو برسوں

بہار جوشِ مستی گُل کھلادے ۔ عروج مئے پرستی رنگ لائے
قلم محوِ عروسِ داستاں ہو سخن گلگونۂ حسنِ بیاں ہو
بنے مَد سُرمۂ چشمِ تمنّا ہر اک نقطہ ہو خالِ روئے معنیٰ
ڈھلے ہوں شعر ہر مصرع ہو رنگیں دولہن ہو شاہدِ حُسنِ مضامیں
کتھا سے ہو کے فارغ وہ مہاجن ہوا مصروف شادی میں ہمہ تن
یہ چاہا شام سندر کا کرے بیاہ خوشی سے ہو قرانِ زہرہؔ و ماہ
کہیں منسوب تھی وہ حور پیکر ہوئی تاریخ شادی کی مقرّر
اسے مانجھے کا جب جوڑا پہنایا الگ اک کنج خلوت میں بٹھایا
جو دیکھا شام سندر نے یہ ساماں ہوا وہ کنج خلوت اس کو زنداں
کہا افسوس یہ کیا آفت آئی فلک نے کیسی یہ بجلی گرائی
حسن ہے چور عشقِ جاں گسل میں سمایا آرزو کی طرح دل میں
غضب ہے جو دل و جاں سے فدا ہو مثالِ غیر پہلو سے جدا ہو
نہ دیکھی خواب میں بھی جس کی صورت بنے وہ میرے دل کا داغ حسرت
نہیں غیرت یہ کرتی ہے گوارا کہ اک ناآشنا ہو خلوت آرا
اگر اس کا نہ ہوتا کچھ مجھے ڈر کہ پھر جائے گا پانی آبرو پر
نکلتی گھر سے مثلِ نکہتِ گل میں جا ملتی حسن سے بے تامّل
لحاظِ طعنِ خویش و اقربا ہے خیالِ این و آں زنجیر پا ہے
حسن کا بھی عبث ہے مجھ کو ارماں کہ میں ہندو کی لڑکی وہ مسلماں
بہم ہے اختلافِ دین و مذہب ملے کس طرح دن سے تیرہ گوں شب
مناسب ہے مرے حق میں یہی بات کہ کچھ کھا کر مروں میں تخت کی رات
یہی کہہ کہہ کے روتی تھی وہ دل میں پڑی تھی سخت فکر جاں گسل میں
برات اس کی جو آئی دھوم کے ساتھ لگی اک چوٹ سی دل پر ملے ہاتھ
جلی دل میں برنگِ شمع سوزاں اُٹھائے پیچ مثلِ عشقِ پیچاں

نکالا سب نے خلوت سے پری کو
دیا اک داغ ماہ و مشتری کو

سنواری اس کی زلفِ عنبر افشاں
پڑا الجھن میں یکسر سُنبلستاں

بندھا زلفِ مسلسل میں جو ناڑا[1]
شفق نے جامۂ گُل رنگ پھاڑا

یہ ہاتھ آیا مجھے چوٹی کا مضموں
چڑھا سر پر کسی بے جرم کا خوں

جو نتھ پہنی فلک پر بندھ گئی دھاک
ہوا غل ہالۂ مہ کی کٹی ناک

جو کانوں میں پڑے جھمکے کرن پھول
دل و جاں سے ہوئے صدقے چمن پھول

دُرِ یکتا ہوئے آویزۂ گوش
فلک پر عقد پر دیں کے اُڑے ہوش

جو پہنی چلپڑی[5] مالا[6] جنن ہار
ہوئے پھر پھر کے صدقے سبع سیّار

گلے میں جب پڑی سونے کی زنجیر
نظر آئی کرن آہِ گلو گیر

جو کی زیبِ گلو نایاب ہیکل
بنایا ماہ کے ہالے کو بے کل

ہوئے جب بانک جوشن زیب بازو
دبائے زہرہ و پرویں کے پہلو

جو پہنے ساعدِ سیمیں میں کنگن
دوبالا ہوگیا ہاتھوں کا جوبن

کمر میں کردھنی سونے کی ڈالی
شعاعِ مہر کو دی جس نے تالی

پڑی جب پاؤں میں انمول خلخال
ہوا اُٹھ اُٹھ کے شورِ حشر پامال

بھرے پوروں میں چھلّے کس بلا کے
بندھے پر طائرِ رنگِ حنا کے

بندھا جب اُسکے سر زرتار سہرہ
کرن میں چھپ گیا سورج کا چہرہ

دولہن جب بَن گئی وہ حور پیکر
فلک نے کردئے تارے نچھاور

شعلہ افشانی

لگی ہے آگ میرے دل میں ساقی
ابھی ہے دخت رز سے لاگ باقی

دھواں اٹھا دلِ اندوہ گیں سے
بجھا دے آگ آبِ آتشیں سے

---

[1] اکثر ہنود میں رواج ہے بیاہ کے روز دلہن کا بال کھلا رکھتے ہیں مگر پیشتر ناڑے سے پیچھے کی طرف باندھ دیتے ہیں کہ منتشر نہ ہوں اور ناڑا صحیح براہ ہندی ہے۔ ۱۲ ع

بلا سے دختِ رز ہے آگ کے مول
گرہ میں باندھ زر بوتل کا مُنھ کھول

جو ہاتھ آجائے جامِ ارغوانی
دکھادوں اپنی میں آتش بیانی

سپند آسا دلِ دشمن جلاؤں
گلستانِ سخن میں گل کھلاؤں

جب آیا وقت رسمِ کدخدائی
حسنؔ نے یہ خبر اُڑتی سی پائی

کہ ہے بیاہ آجکی رات اس پری کا
قِراں ہے اک زحل سے مشتری کا

دل اس کا آتشِ غم نے جَلایا
لپک کر کوچۂ جاناں میں آیا

یہ دیکھا لوگ سب دولہا کو لے کر
چلے جاتے ہیں خوش خوش گھر کے اندر

نظر آیا جو وہ شورِ قیامت
جگر پر غم سے کھایا داغِ حسرت

بدل کر بھیس وہ بھی گھر میں پہونچا
تڑپ کر پہلوے دلبر میں پہونچا

ہوا سنکلپ کا جس وقت ساماں
دولہن الجھی بڑے دولہا کے ارماں

ادا کی پنڈتوں نے خوش بیانی
ہوئی طرفین سے اشلوک خوانی

جو بھانور کی دل افزا نوبت آئی
فلک نے قہر کی بجلی گرائی

حسنؔ کی لائی رنگ آہِ شرر بار
کسی گوشے سے آگ اُٹھی دھواندار

ہوا آتشکدہ دم بھر میں وہ گھر
بنے شہتیر بازوئے سمندر

قیامت کی مچی لوگوں میں ہلچل
گرے اک دوسرے پر ہو کے بیکل

کوئی کھڑکی سے نکلا کوئی در سے
ادھر سے بھاگ نکلے کچھ اُدھر سے

نہ دولہا کی نہ کچھ پروا دولہن کی
پڑی تھی سب کو اپنی جان و تن کی

نظر آیا جو یہ حالِ جگر سوز
کہ اب جلتی ہے یہ شمعِ شب افروز

حسنؔ کا ہو گیا دل شکلِ سیماب
شرارِ شعلۂ اُلفت سے بیتاب

دولہن کو گود میں اپنی اُٹھا کر
گیا دم بھر میں اک کھڑکی سے باہر

پکڑ کر ہاتھ اس کا گھر کی لی راہ
کسی کا گھر جلے تاپے کوئی واہ

یہاں جو رہ گئے گھبرا کے اندر
وہ آخر جل بجھے مانند اخگر

جو پکڑا آگ نے دولہا کا داماں / جل اُٹھا صورتِ سروِ چراغاں
رہا وہ شعلۂ جوالہ کچھ دیر / ہوا جل بجھ کے آخر راکھ کا ڈھیر
حسن اس شعلہ رو کو گھر جو لایا / خوشی سے آنکھیں سیکیں ناز اُٹھایا
جو پایا اس پری کا کچھ بجھا دل / ہوا صدقے کہا اے شمعِ محفل
مرے دل کو ہے تجھ سے اُلفت پاک / ہوس کچھ اور اگر ہو جل کے ہوں خاک
ذرا بجھ جائے آگ اے غیرتِ شمع / حواس اُن دل جلوں کے ہولیں کچھ جمع
ترے گھر لے چلوں تجھ کو یہاں سے / ملادوں تجھکو تیرے باپ ماں سے
جبھی ہے عشقِ صادق کی مرے جانچ / نہ تیری آبرو پر آئے کچھ آنچ
تسلّی دے کے پھر وہ باہر آیا / مثالِ برق گرم اس کے گھر آیا
یہاں تھی کیا خبر کوئی کنھیا / اُڑا کر لے گیا سونے کی چڑیا
یہی کہہ کہہ کے ملتے تھے وہ سب ہاتھ / کہ ہے ہے جل گئے دولہا دولہن ساتھ
حسن نے دیکھ کر وہ حالِ جانکاہ / قدم اپنے اُٹھائے گھر کی لی راہ
دولہن کے پاس آکر یوں وہ بولا / ہوا دولہا تمہارا جل کے کولا
بہت ڈھونڈھا پتا ملتا نہیں ہے / جلیں تم بھی یہی سب کو یقیں ہے
ہجومِ غم میں اکثر پیٹتے ہیں / کبھی چھاتی کبھی سر پیٹتے ہیں
چلو تم کو ملادوں باپ ماں سے / کہیں ٹھنڈے نہ ہوں سوزِ نہاں سے
یہ سن کر شام سندر نے بھری آہ / قدم پر گر پڑی وہ غیرتِ ماہ
کہا بیشک تمہیں ہے پاک اُلفت / اسی نے تو بنائی یہ مری گت
کیا مجھ کو برنگِ برق بیتاب / بنایا دل مرا مانند سیماب
جو کھینچا جذبۂ وحشت نے مجھ کو / گرایا چھت سے اس اُلفت نے مجھ کو
ہوا جب نشۂ اُلفت دوبالا / گلے کا دے دیا انمول مالا
مہینوں میں رہی حاضر کتھا میں / رہی سرگرم دیدار اس سبھا میں

دکھایا آسماں نے پھر یہ نیرنگ
یکایک بیاہ شادی کا بندھا رنگ

کہوں میں کیا جو دل پر چوٹ کھائی
جو بیٹھی مانجھے میں کیا کوفت اٹھائی

سمائی تھی مرے دل میں یہی بات
کہ کھا جاؤں گی میں کچھ تخت کی رات

محبت میں نہ کھوتی شان اپنی
میں دیدیتی مقرر جان اپنی

یہ دیکھو گوشۂ چادر میں کیا ہے
ابھی تک پاس میرے سنکھیا ہے

مجھے ہر دم تھی آہِ گرم سے لاگ
لگی دل کی جو بھیڑ کی لگ گئی آگ

وہاں حاضر تھے میرے بھاگ سے تم
اُٹھا لائے مجھے اس آگ سے تم

مرے جلنے کا جب سب کو یقیں ہے
تو پھر کچھ خوفِ رسوائی نہیں ہے

نکالو گے جو مجھ کو اپنے گھر سے
لگے گی دل میں آگ آہِ جگر سے

جلائے گا مجھے میرا رنڈاپا
جلاپا پھونک دے گا تن سراپا

تمہارے پاس جب خلوت میں بیٹھی
کوئی کیا جانے کس حالت میں بیٹھی

مقرر سب گمانِ بد کریں گے
مرے ماں باپ غیرت سے مریں گے

دل و جاں سے بنوں گی میں پرستار
نہ لے جاؤ مرے گھر مجھ کو زنہار

یہ سنتے ہی حسنؔ کا دل بھر آیا
اُٹھا کر اُس کو چھاتی سے لگایا

کہا اے نو عروسِ بزم اُلفت
حنا بندِ کفِ دستِ محبت

بہارِ غازۂ رُخسارۂ ناز
جمالِ چہرۂ آئینۂ راز

عیاں تم پر ہے میرا حال سارا
غلامِ زر خریدہ ہوں تمہارا

یہ کس مُنہ سے کہوں تم پر فدا ہوں
مگر ہاں بندۂ ناز و ادا ہوں

مجھے ہر دم ہے شوقِ جبہہ سائی
مرے دل کو ہے کب تابِ جدائی

مجھے خاطر تمہاری تھی جو منظور
کہی میں نے وہ بات اے غیرت حور

مری تم آرزو دل گھر تمہارا
تمہاری خاکِ پا آنکھوں کا تارا

مرے گھر میں رہو تم حور بن کر
مری آنکھوں میں ٹھہرو نور بن کر

محبت خیز تھی دونوں کی ہر بات
نیاز و ناز میں آخر کٹی رات

پیوندِ مُواصلت

رہے ساقی یہ محفل تیری آباد — وصالِ دخترِ رز سے دل کو کر شاد
لگا دے جام گلگوں میرے لب سے — ملا دے مجھ کو تو بنت العنب سے
یہ عالم بادۂ پر جوش میں ہو — عروسِ مدعا آغوش میں ہو
ہوئی روشن جو صبح عشرت آگیں — مرتب کی حسنؔ نے بزمِ رنگیں
مسرّت سے احبّا کو بلایا — جگہ دی دل میں آنکھوں پر بٹھایا
ہوا عقدِ نکاح بُلبُل و گُل — مبارک باد کا برپا ہوا غُل
دلوں میں اشتیاقِ گفتگو تھا — اُمنگوں پر مزاجِ آرزو تھا
ہوا جب شاہدِ مہرِ منوّر — تجلّی بخش خلوت گاہِ خاور
سوادِ شام نے گیسو سنوارے — فلک پر مثلِ افشاں چمکے تارے
عروسِ ماہ نے گھونگھٹ اٹھایا — شبِ امّید نے جلوہ دکھایا
گل و بُلبُل ہوئے خلوت میں ہمراز — نیاز و نازِ لطف آگیں سے دم ساز
ہوئے سرمست کیفِ نوجوانی — قدح نوشِ شرابِ کامرانی
ملی لذّت جو کچھ جامِ طرب کی — حیا نے ناز سے رخصت طلب کی
ہوئے دست و بغل وہ لذّت آشام — لئے مینا نے بڑھ کر بوسۂ جام
بڑھے جب حوصلے جوش ہوس کے — گلِ خنداں ہوا غنچہ بکس کے
سرِ مینا ہوا خالی ٹپک کر — لبِ ساغر ہوا گلگوں چھلک کر
ہوئے ارمان محوِ لذّتِ دل — تمنّا نے نکالی حسرتِ دل
ہوا جب گلشنِ اُمّید سیراب — ہوئے دونوں قدح نوشِ مے خواب
غرض شب بھر رہے دونوں ہم آغوش — عروجِ نشۂ عشرت سے مدہوش
ہوئی جب نو عروسِ صبح روشن — سریرِ آسماں پر جلوہ افگن
طلوعِ مہر نے نقشا جمایا — چراغِ ماہِ تاباں جھلملایا

سمیٹا لیلیٰ شب نے جو دامن — نظر آنے لگا کچھ اور جوبَن
نسیمِ صبح نے کی عطربیزی — گلوں نے کی چمن میں مشک ریزی
نو اسنجانِ گلشن نے کیا غُل — اُٹھی بستر سے موجِ نکہت گل
ہوئے وہ دونوں مستِ خواب بیدار — نیاز و ناز کے اُٹھے خریدار
جو چھیڑا دل لگی سے کچھ حسن نے — حیا سے آنکھ نیچی کی دولہن نے
اِدھر گھونگھٹ میں بیٹھی وہ پریزاد — اُدھر نکلا حسن خلوت سے دلشاد

حسنِ معاشرت

رہے کچھ روز ساقی دورِ ساغر — غنیمت ہے یہ بزمِ روح پرور
بغل میں ہے عروسِ کامرانی — طرب انگیز ہے جوشِ جوانی
تمنا ہے کہ دخترِ رز سے مِل کے — نکالوں حوصلے کچھ اپنے دل کے
جہاں تک ہو سکے لوں بوسۂ جام — خدا جانے مرا پھر کیا ہو انجام
ملے جب بُلبُل و گُل دونوں باہم — رہے باغِ جہاں میں شاد و خرّم
بہار شادمانی تھی جو حاصل — رہا خنداں ہر اک کا غنچۂ دل
نہ تھا کچھ غم جفائے آسماں کا — خزاں کا ڈر نہ کھٹکا باغباں کا
شرابِ وصل سے تھے گاہ مخمور — کبھی تھے نشۂ دیدار میں چور
وہ دونوں صورتِ مجنوں و لیلیٰ — دل و جاں سے رہے مفتوں و شیدا
جو ہوتی تھی جدائی اُن میں دم بھر — بپا کرتے تھے محشر دل تڑپ کر
رہے برسوں وہ دونوں بُلبُل و گُل — بہار افروز کیفِ نشۂ مُل

واقعۂ جانکاہ

کہوں کیا آج اپنا حال ساقی — نہیں مجھ میں حواس و ہوش باقی
رواں آنکھوں سے موجِ اشکِ غم ہے — جگر میں جوشِ دریائے اَلم ہے

قیامت خیز ہیں آہوں کے جھونکے
سراسر پست ہیں دل حوصلوں کے

تہ و بالا ہے میری کشتیِ دل
نکلنا لُجّۂ غم سے ہے مشکل

نہیں کچھ آس ہو بیڑا مرا پار
سلامت چھوڑ دیں مینڈھے یہ دشوار

تلاطم میں پڑے ہیں آج ارماں
یہ جوشِ بحرِ غم لے گا مری جاں

پلائے خوب تونے جامِ گلگوں
تری دریا دلی کا میں ہوں ممنوں

کسی کا صدمۂ فرقت ہے جانکاہ
نہیں اَب دخترِ رز کی کچھ مجھے چاہ

بھرا ہے خون سے پیمانۂ دل
اُبلتا ہے مرا میخانۂ دل

بنا ہے سوگ میں ماتم کدہ باغ
گل لالہ کے دل میں غم سے ہے داغ

گریباں چاک ہے گلشن میں ہر گل
ہلا دیتی ہے دل فریادِ بُلبُل

سراپا آہ ہے ہر سرو و شمشاد
چمن میں قمریاں ہیں محوِ فریاد

جوابِ دیدۂ گریاں ہیں نہریں
رگِ بسمل بنی ہیں آج لہریں

رواں ہے اشکِ غم چشمِ قلم سے
کلیجا پھٹ گیا فرطِ اَلم سے

دگرگوں ہو گیا رنگِ زمانہ
سناتا ہوں مصیبت کا فسانہ

حسن کچھ لوگ لے کر اپنے گھر کے
گیا اک سال میلے میں چھتر کے

کئی دن عیش و عشرت میں بسر کی
یکا یک لہر آئی دل میں گھر کی

قدم اپنا برنگِ موج اٹھایا
پہونچ کر گھاٹ پر بیڑا منگایا

سوار اس میں ہوا اسباب کے ساتھ
چلا گھر کی طرف احباب کے ساتھ

ہوئی منجدھار میں جس دم رسائی
چلی آندھی غضب کی آفت آئی

مثالِ کشتیِ دل پھٹ گئی پال
تڑپ کر رہ گئے سب بے پر و بال

جو مارا موجِ دریا نے تھپیڑا
تباہی میں پڑا آخر وہ بیڑا

نہ ''جے گنگا'' کا دریا نے کیا پاس
مدد کرنے کو خضرؑ آئے نہ الیاسؑ

بھنور کی طرح کھا کر پہلے چکّر
گرے کشتی سے آخر لوگ اُلٹ کر

تہ و بالا ہوئے آبِ رواں میں
پڑی ہلچل غضب کی جسم و جاں میں

بنا بیڑی کسی کے موجۂ آب
ہوا حوق میں کسی کے طوق گرداب

کوئی ڈوبا کوئی نکلا کسی طرح
کوئی اُبھرا حُبابِ بحر کی طرح

حسن آغوشِ دریا میں جو آیا
بھنور نے اپنی چھاتی سے لگایا

چلا منجدھار میں اُس کا نہ کچھ بس
بہا دھارے میں آخر صورتِ خس

بہت کچھ ہاتھ پاؤں[1] اس نے جو مارے
تو کوسوں بہہ کے جا پہونچا کنارے

یہاں لوگوں نے اُس سے ہاتھ دھویا
یہ سمجھے موجِ دریا نے ڈبویا

یہ حالِ صدمۂ جانکاہ سُن کر
گری غش کھا کے غم سے شام سُندر

ہوئی بیتاب دردِ جاں گُسل سے
اک آہِ سرد کھینچی اپنے دل سے

کیا بے چین جب دردِ نہاں نے
عدم کی راہ لی روحِ رواں نے

اُسے تھا عشقِ صادق مرگئی وہ
وفا کا نام زندہ کر گئی وہ

ہوا کہرام برپا اُس کے گھر میں
پڑے دو داغ ہر قلب و جگر میں

اُٹھایا آسماں نالوں نے سر پر
ہوا ہنگامۂ آشوبِ محشر

بگولوں نے اُڑائی خاک غم میں
دِرا نے سینہ کوبی کی اَلم میں

اُڑا رنگِ رُخِ خور صورتِ ہوش
شبِ ماتم ہوئی غم میں سیہ پوش

کئے سنبل نے بال اپنے پریشاں
گلوں نے پھاڑ ڈالے جیب و داماں

ہوئے مُرغِ چمن دم سازِ شیون
بنا ماتم کدہ نالوں سے گُلشن

ہلایا عرش فریاد و فغاں نے
بہائے اشکِ شبنم آسماں نے

ہوا آخر گریبانِ زمیں چاک
کیا اُس مہر سیما کو تہِ خاک

شعلۂ جانگداز

کوئی دم کا ہوں میں مہمان ساقی
نہیں سوزِ دروں سے ہوش باقی

لپک ہے شعلۂ داغِ جگر میں
شرارے ہیں کہ آنسو چشمِ تر میں

---

[1] پاؤں کے داؤ کو سین میں ملا کر پڑھو کہ تقطیع میں یہ لفظ وتد یعنی سہ حرفی ہے۔ ۱۲ع

جو آہِ آتشیں سے دل کو ہے لاگ
لگی ہے خانۂ تن میں مرے آگ

دھواں اُٹھتا ہے آہِ آتشیں کا
گھٹا جاتا ہے دم جانِ حزیں کا

کباب آسا دلِ بریاں ہے میرا
چکاں ہر دیدۂ گریاں ہے میرا

کلیجا پک گیا سوزِ اَلم سے
پھنکا جاتا ہے سینہ داغِ غم سے

بلا سے آرزو بھی جل کے ہو خاک
لگی دل کی بجھے ''خس کم جہاں پاک''

کسی کے غم میں مجھ کو مے سے کیا کام
ہتھیلی کا پھپھولا ہے مجھے جام

حسن جب اپنے گھر پہونچا سلامت
نظر آئی وہاں شکل قیامت

سُنا اُس ماہ وَش کا حالِ جانکاہ
جگر پر چوٹ کھائی دل سے کی آہ

اُڑائی خاک پھاڑے جیب و داماں
ہوئے طوق گلو تارِ گریباں

نکل جاتا سوئے گورِ غریباں
جلاتا رو کے شمعِ داغِ سوزاں

ہم آغوشِ مزارِ یار ہوتا
فدائے تربتِ دلدار ہوتا

اُسی صورت سے جب گذرے کئی روز
سُنا لوگوں سے یہ حالِ جگر سوز

کئی دن سے نیا اک ماجرا ہے
سراسر قصۂ حیرت فزا ہے

گذر جاتی ہے آدھی رات جس دم
نظر آتا ہے ہر سو ہُو کا عالم

لبِ آبِ رواں گنگا کے اُس پار
فلک سے ہوتی ہے اک شے نمودار

اُترتی ہے وہ مثلِ ہودجِ نور
خدا جانے پری ہے اس میں یا حور

کچھاروں میں کبھی دریا میں بیتاب
پھرا کرتی ہے مثلِ موجۂ آب

یہی اس کی صدائے پُر محن ہے
کہاں کس رنگ میں تو اے حسن ہے

ترے غم میں اٹھایا زیست سے ہاتھ
نکل آئی مری جاں آہ کے ساتھ

جدائی کا یہ میں نے داغ کھایا
عدم میں بھی کہیں تجھ کو نہ پایا

کلیجے سے دھواں اُٹھتا ہے ہر بار
لگی ہے آگ سینے میں دھواندھار

سراسیمہ یونہی کچھ دیر رہ کر
وہ اُڑ جاتی ہے بامِ آسماں پر

یہ سنتے ہی حسن نے کھینچی اک آہ
سپند آسا تڑپ کر گھر کی لی راہ

جو پہنچا اپنے گھر وہ شعلہ پیوند　　کئے سب واقعات اپنے قلم بند

یہ لکھا اُس نے پھر پُر سوز مضموں　　کہ جی میں ہے لگی دل کی بجھاؤں

میں دھوکر ہاتھ جانِ ناتواں سے　　ملوں اُس شعلۂ آتش فشاں سے

مری خاطر نہ ہوں احباب ناشاد　　دعائے خیر سے مجھ کو کریں یاد

ہوئی جب شام یاروں کو بلایا　　کہا ہے آج عزم سیر دریا

عجب کیا ہے طبیعت کچھ بہل جائے　　دلِ دیوانہ کی حالت بدل جائے

کرے تسکین خاطر موجۂ آب　　تسلّی بخش جاں ہو رقص گرداب

نہ تھا دل کی لگی سے کوئی آگاہ　　چلے سب سوئے دریا اُس کے ہمراہ

لبِ ساحل ہوئی جس دم رسائی　　حباب و موج نے کی پیشوائی

پھر اک کشتی میں چڑھ کر سب وفادار　　ہوا کھاتے ہوئے جا پہونچے اُس پار

حسن بولا لبِ ساحل اُتر کر　　لگاؤں گا یہیں میں آج بستر

کہا یاروں نے کیا سودا ہوا ہے　　یہاں موقع بھلا رہنے کا کیا ہے

وہ بولا اک عمل کرنا ہے مجھ کو　　یہاں نقشِ اَمل بھرنا ہے مجھ کو

جو جی چاہے رہو تم تا سحر گاہ　　جو ڈرتے ہو تو اپنے گھر کی لو راہ

جو گذرے گی بلا سے ہم سہیں گے　　اگر جیتے رہے کل مِل رہیں گے

کہا یاروں نے کیونکر چھوڑ دیں ہم　　رُکھائی کر کے کیا دل توڑ دیں ہم

یہیں ہم بھی بسر شب بھر کریں گے　　تصدّق جان و دل تم پر کریں گے

وہیں آخر لگایا سب نے بستر　　جب آدھی رات گذری تانی چادر

احبا سورہے وحشت کے مارے　　حسن گنتا رہا کچھ دیر تارے

کیا تھا چاندنی نے ہر طرف کھیت　　ادھر گنگا نظر آتی اُدھر ریت

ہوا جب ایک عالم نیند میں چور　　گرا پیلِ فلک کا ہودجِ نور

حباب آسا پھرا پہلے سرِ آب　　ہوا خشکی میں پھر سرگرم و بیتاب

حسنؔ نے اپنے یاروں کو اُٹھایا　　طلسمِ شعلۂ گردوں دکھایا
یکا یک یہ صدائے حسرت انگیز　　ہوئی ہر خرمنِ دل پر شرر ریز
کہاں تم اے حسنؔ رونق فزا ہو　　نہیں ملتے ہو کیوں کیا کچھ خفا ہو
نہیں تم کو خیال شام سُندرؔ　　ہوا کیا غم میں حالِ شامؔ سُندر
لگی رہتی ہے دل میں آگ دن رات　　بجھاتے کیوں نہیں تم آ کے ہیہات
ہوئی جب گوش زد وہ نوحہ خوانی　　حسنؔ کا ہو گیا دل پانی پانی
نکالی جیب سے تحریر اپنی　　کتابِ قصۂ تقدیر اپنی
کسی ہمدم کو دے کر برق آسا　　سوئے شعلہ ہوا وہ گام فرسا
پکارا شام سُندر شام سُندر　　حسنؔ میں ہوں پریشاں حال و ششدر
غرض لپکا اِدھر سے کچھ وہ مہجور　　اُدھر سے کچھ بڑھا وہ ہودجِ نور
ہوئی مُڈبھیڑ اُن دونوں میں جس دم　　ہوئے سرگرم رقص دو جسد باہم
حسنؔ تھا جذبِ اُلفت سے جو مجبور　　ہوا رونق فروزِ ہودجِ نور
در آیا شعلہ میں پروانۂ عشق　　بھڑک اُٹھا چراغِ خانۂ عشق
ہوا مثلِ پری وہ شعلہ رقصاں　　اُڑا پھر صورت تختِ سلیماں
فلک[1] پر چڑھ گیا دم بھر میں سن سے　　اُٹھایا ہاتھ یاروں نے حسنؔ سے
سوادِ شب نے پہنا جامۂ غم　　بہائے آسماں نے اشکِ شبنم
سحر نے پھاڑ کر جیب و گریباں　　دکھایا داغِ خورشید درخشاں
بھنور کا دل بھر آیا جوشِ غم سے　　سراسیمہ ہوئیں موجیں الم سے
ہوئی چشمِ حبابِ بحر گریاں　　اُٹھا دریا میں جوشِ غم کا طوفاں
سُنا جس نے یہ حالِ حیرت انگیز　　جگر سے کھینچی آہِ حسرت آمیز
ہوا بیتاب بھڑکا شعلۂ غم　　دھواں اُٹھا دلِ سوزاں سے پیہم
غضب ہوتی ہے سوزِ عشق کی لاگ　　کہ پانی میں لگا دیتی ہے یہ آگ

خاتمۂ کتاب

ہوئی بزمِ سخن سنسان ساقی
ہزاروں ہیں ابھی ارمان باقی
اُبل کر رہ گیا میخانۂ دل
لہو سے بھر گیا پیمانۂ دل
جو لکھا میں نے یہ افسانۂ عشق
ہوا بیخود دلِ دیوانۂ عشق
برنگِ گیسوئے پُرپیچ جاناں
ہوا مجموعۂ خاطر پریشاں
ہوئے زخمِ دلِ صد چاک آلے
کھلے سینے میں داغِ غم کے لالے
چبھا ہر شعر دل میں شکل مژگاں
ہوا ہر حرف نوکِ نشترِ جاں
نظر میں پھر گیا اگلا زمانہ
مجھے یاد آگیا اپنا فسانہ
کبھی مجھ پر بھی احسانِ جنوں تھا
سرشک آنکھوں میں دل میں جوشِ خوں تھا
کبھی تھی دود آہِ گرم سے لاگ
لگی تھی خانۂ دل میں مرے آگ
ہوا جل بجھ کے دل خاکِ سیہ لاکھ
ابھی تک ہے مگر کچھ گرم یہ راکھ
رُلاتا ہے خیالِ شامؔ سُندر
ہوئے ہیں دیدۂ گریاں سمندر
حسنؔ کی سرگذشتِ حسرت انگیز
مثالِ برق دل پر ہے شرر ریز
جگر میں داغِ حسرت شعلہ زن ہے
لبوں پر آہ سینے میں جلن ہے
قلم ہے صدمۂ غم سے جگر چاک
سیاہی ہے سوادِ چشم نمناک
کہاں تک شوقؔ یہ پُرغم کہانی
کرو اب ختم اپنی نوحہ خوانی
اگر ہے فکر تاریخ دلآویز
تو لکھو مثنوی ۱۲ حیرت ۱۳ ھ انگیز

سنو پھر سالِ تاریخ خدا داد
پسندِ خاطرِ ہر باصفا باد
۱۲ ۱۳ھ

لے عشق کے بھی عجب کرشمے ہیں، خدا جانے حسنؔ کا جسم خاکی کیا ہوا۔ دریا میں جا پڑا یا جل کر غبار کی طرح اُڑ گیا کہ کسی کو کچھ پتا نہ ملا۔ ۱۲ عرشی۔

قطعۂ تاریخ طبعزاد سخنور عالی دماغ

فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی

مثنوی جس کا نام سوز و گداز　　اس سے بہتر نہیں فسانۂ شوقؔ
حضرتِ شوقؔ کی ہے یہ تصنیف　　باعثِ رونقِ زمانۂ شوق
معدنِ طبع میں ہے گوہر عشق　　مخزنِ دل میں ہے خزانۂ شوق
انہیں اشعار کی زمین وہ ہے　　جس میں پیدا ہوا ہے دانۂ شوق
اس سے لبریز جام بادۂ عشق　　اس سے آباد عیش خانۂ شوق
ہیں جو اہلِ مذاق ان کے لئے　　یہ سخن ہو گیا بہانۂ شوق

تو بھی لکھ داغؔ مصرعِ تاریخ
سنو دل سے یہ ہے ترانۂ شوق

۱۲　　۱۳ھ

نتیجۂ فکر بلبلِ گلزار بلاغت جناب سید عباس حسن صاحب
فصاحت خلف جناب سید آغا حسن لکھنوی مرحوم متخلص بہ امانتؔ

ہیں اک شفیق و دوست جو میرے جنابِ شوقؔ　　ذی علم و ذی کمال و سخن سنج و مولوی
نازک خیال صاحبِ تحقیق اہلِ فہم　　اچھی طرح ہیں واقفِ اسرار شاعری
شہرہ ہے جن کی سحر بیانی کا چار سو　　تصنیف اُنہیں نے کی ہے یہ دلچسپ مثنوی
عشاق دردمند کا تو ذکر کیا بھلا　　معشوق شوخ طبع کو مرغوب ہو گئی
شیریں جو ہے کلام تو کہتے ہیں اہلِ ذوق　　ایسی تو نظم دیکھی نہ ہم نے سُنی کبھی
مضمون استعارے مثالیں محاورے　　لطفِ زباں کے ساتھ صفائی بھی نظم کی

دیتے سخن کی داد مصنّف کو وہ ضرور　　ہوتے جو آج حافظؔ و عرفیؔ و انوریؔ
ہے وقت فکر تم کو فصاحتؔ جو یہ خیال　　صنعت میں نکلے مصرعِ تاریخ ابھی کوئی

ہجری سنین لکھو زُبرو بیّنات میں
یہ مثنوی ہے واہ عجب بے بدل کہی

۱۲　　۱۳ھ

فرہنگ

صفحہ۔44

پیک۔ قاصد، ہرکارہ

سواد۔ نواح، پڑوس

شیوابیانی۔ فصیح البیانی

شہباز۔ ایک شکاری پرندہ، اسے باز بھی کہتے ہیں

روح الامین۔ حضرت جبرئیلؑ کا لقب

شاہد پاک۔ مراد خداوند تعالیٰ

طور۔ وہ پہاڑ جس پر حضرت موسیٰؑ کو خدا کا جلوہ نظر آیا

کلیم اللہ۔ حضرت موسیٰؑ

لن ترانی۔ معنی ہرگز نہیں۔ تشریح۔ موسیٰؑ نے اصرار کیا تھا کہ خدا تعالیٰ اپنا جلوہ دکھائے۔ اس پر خدا نے جواب دیا تھا کہ تو مجھے دیکھ ہی نہیں سکتا

سیم تن۔ چاندی کے جسم والا۔ مراد گورے بدن والا، خوبصورت معشوق

برگِ سمن۔ چمیلی کے پھول کی پنکھڑی یا پتی

سرو۔ ایک سیدھے درخت کا نام، خوش قد معشوق کو سرو سے تشبیہہ دیتے ہیں

قمری۔ ایک مشہور طوق دار پرندہ کا نام، یہ فاختہ کی قسم سے ہوتا ہے

صفحہ۔45

صد برگ۔ وہ پھول جسکی بہت سی پنکھڑیاں ہوں، مراد گیندا

سوسن۔ ایک قسم کے آسمانی رنگ کے پھول کا نام جسے شعرا زبان سے تشبیہہ دیتے ہیں

رتجگا۔ رات کو جاگنا۔ ایک رسم کا نام

طیّاری۔ تیاری، شوق کے عہد میں 'ت' کی جگہ 'ط' لکھتے تھے

خرد۔ عقل

منزّہ۔ پاک صاف، مقدّس، متبرک

مبرّا۔ بے عیب، پاک، معصوم، آزاد

دمساز۔ ہمراز، دوست

خجل۔ شرمندہ

عرفان۔ علم، آگہی

معرفت۔ علم و آگہی

صفحہ۔46

لیلۃ القدر۔ مرتبہ والی رات، ماہ رمضان کی راتوں میں سے ایک رات، غالباً

ستائیسویں رات

بدر۔ ماہِ کامل، پورا چاند

خال۔ تِل

سویدا۔ وہ سیاہ نقطہ جو دل پر ہوتا ہے

آبِ حیواں۔ زندگی کا پانی، مشہور ہے کہ اس کے پینے سے قیامت تک موت نہیں آتی

سبزۂ خط۔ خطِ رخسار

زنخداں۔ ٹھڈی

مَلک۔ فرشتے

قلم۔ شاخ (صراحی کی گردن)

مہرِ نبوّت۔ وہ نقش مبارک جو رسول اللہؐ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان تھا

خاتم۔ انگوٹھی، مہر

بُراق۔ وہ بہشتی خچر جس پر رسول اللہؐ شبِ معراج کو سوار ہو کر عرش معلّیٰ پر تشریف فرما ہوئے

صفحہ۔47

قدح۔ پیالہ، خصوصاً وہ پیالہ جس میں شراب پی جاتی ہے

خُم۔ مٹکا، جس میں شراب رکھی جاتی ہے

سرپوش۔ ڈھکّن، جس سے خم کو چھپایا جاتا ہے

کلک۔ قلم

دُرِ عدن۔ عدن کا موتی

عظیم آباد۔ شہر پٹنہ کا قدیم نام

ریاض۔ باغ

صفحہ۔48

جور۔ ظلم

قدم لینا۔ استقبال کرنا

آبِ بقا۔ آبِ حیات جس کو پی کر انسان ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتا ہے۔

سحاب۔ بادل

چینِ جبیں۔ پیشانی کی شکن

قوسِ قزح۔ دھنک

مژگاں۔ پلکیں

پیکاں۔ تیر

فتنہ پرداز۔ فتنہ پیدا کرنے یا کھڑا کرنے والا

صفحہ۔49

ذقن۔ زنخداں، ٹھڈی

ساقِ پا۔ گھٹنے اور ٹخنے کے درمیان کا حصہ، پنڈلی

صور۔ قرنا، نفیری، بگل

اُفتادہ۔ گرا ہوا

صفحہ۔50

تحیّر آشنا۔ حیرت آشنا

آب آب ہونا۔ پانی پانی ہونا، شرمندہ ہونا

زلفِ معنبر۔ عنبر کی طرح سیاہ اور خوشبودار زلف

مشک۔ ایک قسم کی خوشبو

آبِ گہر۔ موتی کی تڑپ یا تابانی

ناہید۔ ایک تارے کا نام

بُرج آبی۔ سرطان، عقرب یعنی ستارے کا ایک مقام

حیوان آبی۔ پانی کے اندر رہنے والا جانور

صفحہ۔51

سِلک گوہر۔ موتیوں کی لڑی یا وہ دھاگا جس میں موتی پروتے ہیں

خور۔ خورشید کا مخفف، سورج

نخچیر۔ شکار

تاسّف۔ افسوس

دردِ نہاں۔ پوشیدہ درد، چھپا ہوا درد

صفحہ۔52

نیرنگ۔ فریب، طلسم، جادو، سحر

ننگ۔ حجاب، شرم، غیرت

بگولہ۔ آندھی، بونڈر

وارفتگی۔ بیخودی، شیفتگی، اضمحلال

دل تفتگی۔ دل کا جلنا

بلائے جاں گسل۔ ایسی بلا جو جان لیوا ہو یعنی جان کو گھلا دینے والی بلا

زہرہ شمائل۔ زہرہ کی طرح خوبصورت

سودائی۔ دیوانہ

آہ ہمدم۔ ٹھنڈی سانس

صفحہ۔53

آب دیدہ۔ آنسو، آنکھ کا پانی

غمّازی۔ اشارہ

سینہ افگار۔ زخمی سینہ والا

زلف دوتا۔ زلف خم بہ خم، خمدار گیسو

کوئے صنم۔ محبوب کی گلی

بسمل۔ زخمی نیم جان

صفحہ۔54

کلیجہ مُنہ کو آنا۔ بہت زیادہ غم زدہ ورنجیدہ ہونا

خندہ۔ ہنسی

فغاں۔ نالہ، فریاد

شمشاد۔ ایک خوشنما اور اونچے درخت کا نام، اُسے محبوب کے قد سے تشبیہہ دیتے ہیں

بیداد۔ ظلم

صفحہ۔55

اعزّا۔ عزیز واقارب

درا۔ جرس، گھنٹی

فصّاد۔ فصد دینے والا

ناتواں۔ کمزور

مردمک۔ آنکھ کی پُتلی

کڑی۔ مصیبت، رنج وغم

زلفِ پُرخم۔ شکن آلود زلف

سلاسل۔ زنجیر

شورِ محشر۔ قیامت کا ہنگامہ

بندِ الم۔ غم کی بندش

گل اندام۔ پھول جیسے بدن والے۔ مراد محبوب۔
جو عام طور پر نازک ہوتے ہیں

شرف اندوز دیدار۔ دیدار کا شرف حاصل کرنا

صفحہ۔56

آہ نیمکش۔ چپکے چپکے ٹھنڈی سانس لینا

سنان۔ بھالا

ہوک۔ درد، آہ، نالہ

حرف آنا۔ الزام لگنا

راز طشت از بام۔ بھید کا کھل جانا

اوڑنچھو۔ دفعتاً غائب ہونا

صفحہ۔57

طوق۔ پٹہ جو گلے میں ڈالا جاتا ہے

گُلال۔ عبیر، سرخ رنگ جو ہولی کے دنوں میں
لوگ ایک دوسرے پر چھڑکتے ہیں۔

اَحِبا۔ دوست، احباب

حالِ زبوں۔ برا حال

دخترِ رز۔ انگور کی شراب

طاقتِ طاق ہوگئی۔ طاقت ختم ہوگئی، جواب دے گئی

مرد خود فراموش۔ ایسا انسان جو خود کو بھول جائے،
بیخود

صفحہ۔58

منت کش۔ احسان مند

آشوب پرور۔ ہنگامہ پرور طور پر نازک ہوتے ہیں

کتان۔ ایک قسم کا باریک کپڑا جس کی نسبت
مشہور ہے کہ چاندنی میں ٹکڑے
ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

ماہِ مبیں۔ روشن چاند

خواب دوشیں۔ گذشتہ رات کا خواب

صفحہ۔59

فغاں نیمکش۔ آہِ نیمکش، ٹھنڈی سانس لینا ہلکے
ہلکے آہ نالہ کرنا۔

زینۂ بام۔ کوٹھے کی سیڑھی

قدم لینے کو۔ استقبال کرنے کو

درا۔ جرس، گھنٹی

مہجور۔ جدائی کا مارا ہوا، غمزدہ

صفحہ۔60

فرط ناخوشی۔ غم کی افراط

گبر۔ کافر، آتش پرست

رشتۂ تسبیح۔ تسبیح کا دھاگا

زنار۔ جنیؤ

قلق۔ غم، صدمہ

دود۔ دھنواں

اِستادہ۔ کھڑا ہوا

چشمِ بد۔ بری نظر

صفحہ۔61

پیر مغاں۔ ساقی

بھٹی۔ شراب خانہ

خار مغیلاں۔ ببول کے کانٹے

ہم جادہ۔ ہم سفر، ہمراہ

صفحہ۔62

بھبھوت۔ راکھ

لنگوٹا۔ لنگوٹی

دسپنا۔ چوتنا

مرگ چھالا۔ ہرن کی کھال

سوانگ۔ بہروپ

چتر۔ خیمہ، چھاتا، چھتری

نہ کل پرتی تھی الخ۔ غم سے تھوڑی دیر کیلئے بھی چین نہیں ملتا تھا

صفحہ۔63

مونس۔ غمخوار، دوست، ہمراز

محرم۔ آشنا، دوست، رازدار

ہمدم۔ دوست

شوریدہ جاں۔ پریشان حال، بدحواس

مالا۔ ہار

فرط طرب۔ خوشی کی فراوانی

وجد۔ حالت بیخودی، شیفتگی میں غشی کی حالت

چشم سخن گو۔ بولتی ہوئی آنکھ

روگ۔ مرض

جوگ۔ درویشی، فقیری، سنیاس

چھوٹی پٹن دیوی۔ عظیم آباد (پٹنہ) کے ایک محلے کا نام

صفحہ۔64

غبارِ کوئے رسوائی۔ رسوائی کی گلی کی دھول

غازہ۔ پاوڈر یا روغن جو چہرے پر ملتے ہیں

نظر بند۔ گرفتار

دہ چند۔ دس گناہ

خاک بیز کوچہ غم۔ غم کی گلی کی خاک چھاننے والا

اشنان۔ غسل

انچھر۔ جادو منتر

داری۔ قربان ہونا

تقصیر۔ قصور

صفحہ۔65

پُرفن۔ فن سے بھرا ہوا مراد چالاک، ہوشیار

بھاکا۔ بھاشا، وہ زبان جس میں تلسی داس نے رامائن لکھی ہے

کتھا۔ کہانی، خاص طور پر رامائن کی کہانی کو کہتے ہیں

قشقہ۔ پجاری پیشانی پر چندن اور صندل سے جو لکیریں بناتے ہیں اسے قشقہ کہتے ہیں

کنٹھی۔ مالا

پوتھی۔ کتاب

کبت۔ بھاکا کے اشعار

صفحہ۔66

مہاجن۔ سوداگر، بنیا

کاشی جی۔ یوپی کا مشہور شہر بنارس

کرپا۔ مہربانی

سامعین۔ سُننے والے

نہفتہ۔ پوشیدہ، چھپا ہوا

صفحہ۔67

تلسی۔ ہندی کے بہت بڑے شاعر، رام چرترمانس کے مصنف

بالمیکی۔ سنسکرت کے وہ عظیم شاعر جن کی تصنیف رامائن ہے

آفریں۔ کلمۂ تحسین

ضرر۔ نقصان

صفحہ۔68

ترنم ساز۔ ترنم پیدا کرنے والا یا گانا بنانے والا

ہزار۔ ایک گانے والی چڑیا کا نام

پپیہے۔ ایک گانے والی چڑیا کا نام، کہتے ہیں کہ اس کا نر نہیں ہوتا

مشاطہ۔ دلہن کو سنوارنے والی عورت

چھکادے۔ مست کردے

قراں۔ اجتماع (دو ستاروں کا آپس میں ملنا)

مانجھا۔ مائیوں، شادی کے پہلے کی رسم

کُنج۔ گوشہ

صفحہ۔69

بے تامّل۔ بے جھجک

خویش و اقربا۔ اپنے بیگانے، عزیز و اقارب

تیرہ گوں شب۔ سیاہ رات

کچھ کھا کر۔ مراد زہر کھا کر

تخت کی رات۔ بیاہ کی رات، شب زفاف

عشق پیچاں۔ ایک تدار پودا جس کے پھول سرخ رنگ کے ہوتے ہیں

نتھ۔ ایک زیور جو ناک میں عورتیں پہنتی ہیں دھاک بندھ جانا۔ رُعب جم جانا

ناک کٹنا۔ عزت و آبرو خاک میں ملنا

جھمکے۔ کان کا ایک زیور

کرن پھول۔ کان کا ایک زیور

پچلڑی۔ پانچ لڑیوں کی، پانچ ڈوریوں میں موتی یا سونے کی دانوں کا پرویا ہوا زیور

چنپہار۔ گلے کا ایک زیور

سبع سیارہ۔ سات ستارے

صفحہ۔70

ہیکل۔ گلے کا ایک زیور

جوشن۔ بازو کا ایک زیور

ساعد سیمیں۔ گوری کلائی

کنگن۔ ہاتھ کا زیور

بانک۔ بازو پر باندھنے کا زیور

کردھنی۔ کمر کا زیور

تالی دنیا۔ شرمندہ کرنا، محجوب کرنا

خلخال۔ پازیب

پور۔ اُنگلی کا جوڑ

چھلّے۔ اُنگلیوں میں پہننے کے حلقے

دل اندوہگیں۔ غمگین دل

آبِ آتشیں۔ مراد شراب

سپند۔ باریک نقطہ کے مانند کالے رنگ کے بیج ہوتے ہیں اور لوگ نظرِ بد سے بچانے کیلئے انہیں جلاتے ہیں

کدخدائی۔ شادی

زحل۔ ایک ستارہ کا نام جو سخت منحوس سمجھا جاتا ہے

مشتری۔ ایک سیارے کا نام

صفحہ۔71

سنکلپ۔ دان، خیرات، نذر و نیاز

اشلوک خوانی۔ اشلوک پڑھنا

بھانور۔ ہندوؤں کے بیاہ کی ایک رسم کا نام

شہتیر۔ دھرن، وہ موٹی کنڈی جو چھپر کو سنبھالنے کے لیے دیوار پر رکھی جاتی ہے

سیماب۔ پارہ

اخگر۔ چنگاری

سروِ چراغاں۔ اک قسم کا جھاڑ و جو سرو کے درخت کے مانند ہوتا ہے اور محفلوں میں روشن کیا جاتا ہے

شعلۂ جوآلا۔ بھڑکتا ہوا شعلہ

صفحہ۔72

کنھیا۔ سری کرشن جی

کولا۔ کوئلہ

انمول۔ بیش قیمت

صفحہ۔73

سنکھیا۔ ایک قسم کا زہر جو انسان کو ہلاک کر دیتا ہے

بھاگ۔ قسمت

رنڈاپا۔ بیوگی

جلاپا۔ کڑھن

حنا۔ مہندی

جبہہ سائی۔ سجدہ کرنا، پیشانی ٹیکنا

صفحہ۔74

مواصلت۔ وصل ہونا، مل جانا

بنت العنب۔ انگور کی بیٹی مراد شراب

خاور۔ مشرق

بکسنا۔ کھلنا

صفحہ۔75

سریر۔ تخت، سنگھاسن

صفحہ۔76

مفتون۔ شیدا

مُل۔ شراب

لُجہ۔ دریا، ندی

مینڈھے۔ لہر، موج، تلاطم

تلاطم۔ طوفان، ہیجان

صدمۂ فرقت۔ جدائی کا غم

سوگ۔ رنج و غم

ع گیا اک سال....چھتر کے۔ صوبہ بہار میں چھتر ایک مقام کا نام ہے جہاں پر ہر سال ایک زبردست میلہ لگتا ہے

صفحہ۔77

بیڑا۔ کشتی

منجدھار۔ تلاطم، طوفان

پال۔ بادبان

خضرؑ۔ ایک پیغمبر کا نام جو بھولے بھٹکوں کو راستہ بتاتے ہیں

الیاسؑ۔ ایک پیغمبر کا نام جو دریا یا سمندر میں سفر کرنے والوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور ان کی حکومت دنیا کے بحری حصّوں پر ہے

کہرام۔ ہنگامہ، شور

صفحہ۔78

شیون۔ آہ و نالہ، گریہ وزاری

بریاں۔ بھنا ہوا

چکاں۔ ٹپکتا ہوا

تربت۔ مزار

صفحہ۔79

ہودج۔ عماری، اونٹ کا کجاوہ محل

کچھار۔ دریا کے کنارے کا نشیبی علاقہ

محن۔ رنج، مصیبت

زیست۔ زندگی

سراسیمہ۔ گھبرایا ہوا، خوف زدہ

صفحہ۔80

امَل۔ امید، آرزو

رُکھائی۔ بے التفاتی، بداخلاقی

تانی۔ اوڑھی

ہیہات۔ کلمۂ افسوس

صفحہ۔81

ششدر۔ حیران

مڈھ بھیڑ ہونا۔ دوچار ہونا، ملاقات

جَسَد۔ جسم

سَن سے۔ تیزی سے

سُنسان۔ ویران

صفحہ۔82

آلے۔ زخم کا سرخ ہونا

سرشک۔ آنسو

باصفا۔ پاک، پاکیزہ

محن۔ رنج، مصیبت

زیست۔ زندگی

چند اہم کتابیں

اُردو تنقید پر ایک نظر پروفیسر کلیم الدین احمد	اُردو شاعری پر ایک نظر۔ جلد اوّل (پُرانی شاعری) پروفیسر کلیم الدین احمد
اُردو شاعری پر ایک نظر۔ جلد دوم (نئی شاعری) پروفیسر کلیم الدین احمد	اُردو زبان اور فنِ داستان گوئی پروفیسر کلیم الدین احمد
عملی تنقید پروفیسر کلیم الدین احمد	آموزشِ اُردو (بی۔ایڈ کے طلبہ وطالبات کے لئے) پروفیسر رضیہ تبسم
واردات/ منشی پریم چند مقدمہ: پروفیسر اعجاز علی ارشد	مثنوی سوز وگداز/ شوق نیموی مقدمہ: پروفیسر سید مظفر اقبال
خدنگ جستہ (ناولٹ) عزیز احمد مقدمہ: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی	توبتہ النصوح/ ڈپٹی نذیر احمد (ایک تلخیص، ایک تجزیہ) مقدمہ: پروفیسر اعجاز علی ارشد
شکوہ جواب شکوہ/ اقبال پیش لفظ: ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ	فکر تونسوی: حیات وخدمات ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ

بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴

Book Emporium

Urdu Bazar, Sabzi Bagh, Patna-800004 (Bihar)
Mobile : 09304888739, Phone : 0612-2370267 (Resi)

MASNAVI SOZ-O-GUDAZ

Shauque Neemvi

Compiled by

S.M. Iqbal

BOOK EMPORIUM, PATNA-4